خاکم بدہن

مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی

خاکم بدہن

(خاکے اور مضامین)

حسامی بک ڈپو
مچھلی کمان، حیدر آباد ۵۰۰۰۰۲

اشاعت ۱۹۸۴ء

تعداد ایک ہزار

طباعت [illegible] پریس حیدرآباد

ناشر حسامی بک ڈپو

مچھلی کمان، حیدرآباد (انڈیا)

ادریس فاطمہ

کے نام

ترتیب

دستِ زلیخا

بابائے انگریزی ڈاکٹر سیموئل جانسن کا یہ قول دل کی سیاہی سے لکھنے کے لائق ہے کہ جو شخص روپے کے لالچ کے علاوہ کسی اور جذبے کے تحت کتاب لکھتا ہے، اس سے بڑا احمق روئے زمین پر کوئی نہیں۔ ہمیں بھی اس کلیے سے حرف بہ حرف اتفاق ہے، بشرطیکہ کتاب سے مراد وہی ہے جو ہم سمجھے ہیں، یعنی چیک بک یا روکڑ بہی۔ دیباچے میں یہ وضاحت ازبس ضروری ہے کہ یہ کتاب کس مالی یا الہامی دباؤ سے نڈھال ہو کر لکھی گئی۔ چنانچہ جو اہلِ قلم ذہین ہیں وہ مُشک کی طرح خود بولتے ہیں۔ جو ذرا زیادہ ذہین ہیں وہ اپنے کندھے پہ دوسروں سے بندوق چلواتے ہیں۔ خود دیباچہ لکھنے میں وہی سہولت اور فائدے مضمر ہیں، جو خودکشی میں ہوتے ہیں۔ یعنی تاریخِ وفات، آلۂ قتل اور موقع واردات کا انتخاب صاحبِ معاملہ خود کرتا ہے۔ اور تعزیراتِ پاکستان میں یہ واحد جرم ہے، جس کی سزا صرف اس صورت میں ملتی ہے کہ ملزم ارتکابِ جرم میں کامیاب نہ ہو۔ ۱۹۶۱ میں پہلی ناکام کوشش کے بعد بحمداللہ ہمیں ایک بار پھر یہ سعادت بقلم خود نصیب ہو رہی ہے۔ تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ۔

یہ کتاب 'چراغ تلے' کے پورے آٹھ سال بعد شائع ہو رہی ہے۔ جن قدردانوں کو ہماری پہلی کتاب میں تازگی، زندہ دلی اور جواں سالی کا عکس نظر آیا، ممکن ہے، ان کو دوسری میں کہولت کے آثار دکھلائی دیں۔ اس کی وجہ ہمیں تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ اُن کی عمر میں آٹھ سال کا اضافہ ہو چکا ہے۔

انسان کو حیوانِ ظریف کہا گیا ہے۔ لیکن یہ حیوانوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے اس لیے کہ دیکھا جائے تو انسان واحد حیوان ہے جو مصیبت پڑنے سے پہلے مایوس ہو جاتا ہے۔ انسان واحد جاندار ہے، جسے خلاقِ عالم نے اپنے حال پر رونے کے لیے غدودِ گریہ بخشے ہیں۔ کثرتِ استعمال سے یہ بڑھ جائیں تو حساس طنز نگار دُنیا سے یُوں خفا ہو جاتے ہیں جیسے اگلے وقتوں میں آقا نمک حرام لونڈیوں سے رُوٹھ جایا کرتے تھے۔ لغزشِ غیر پر انھیں ہنسی کے بجائے طیش آجاتا ہے۔ ذہین لوگوں کی ایک قسم وہ بھی ہے جو احمقوں کا وجود دم بھر کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ لیکن، جیسا کہ مارکوئس دی سید نے کہا تھا، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سبھی انسان احمق ہوتے ہیں۔ موصوف نے تو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ اگر تم واقعی کسی احمق کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے تو خود کو اپنے کمرے میں مقفّل کر لو اور آئینہ توڑ کر پھینک دو۔

لیکن مزاح نگار کے لیے نصیحت، فضیحت اور فہمائش حرام ہیں۔ وہ اپنے اور تلخ حقائق کے درمیان ایک قدِ آدم دیوارِ قہقہہ کھڑی کر لیتا ہے۔ وہ اپنا رُوئے خنداں سُورج مکھی پھول کی مانند، ہمیشہ سرچشمۂ نور کی جانب رکھتا ہے اور جب اس کا سُورج ڈوب جاتا ہے تو اپنا رُخ اُس سمت کر لیتا ہے جدھر سے وہ پھر طلوع ہوگا:

ہمہ آفتاب بینم، ہمہ آفتاب گویم
نہ شبم، نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گریم

حسِ مزاح ہی در اصل انسان کی چھٹی حس ہے۔ یہ ہو تو انسان ہر مقام سے آسان گزر جاتا ہے

بے نشہ کس کو طاقتِ آشوبِ آگہی

یُوں تو مزاح، مذہب اور الکحل ہر چیز میں بآسانی حل ہو جاتے ہیں، بالخصوص اُردُو ادب میں۔ لیکن مزاح کے اپنے تقاضے، اپنے ادب آداب ہیں۔ شرطِ اوّل یہ کہ برہمی، بیزاری اور کدورت دل میں راہ نہ پائے۔ ورنہ یہ بومرنگ پلٹ کر خود شکاری کا کام تمام کر دیتا ہے۔ مزا تو جب ہے کہ آگ بھی لگے اور کوئی اُنگلی نہ اُٹھا سکے کہ "یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے؟" مزاح نگار اُس وقت تک تبسّمِ زیرِ لب کا سزاوار نہیں، جب تک اُس نے دُنیا اور اہلِ دُنیا سے رَج کے* پیار نہ کیا ہو۔ اُن سے۔ اُن کی بے مہری و کم نگاہی سے۔ اُن کی سرخوشی و ہُشیاری سے۔ اُن کی تردامنی اور تقدّس سے۔ ایک پیمبر کے دامن پر پڑنے والا ہاتھ گُستاخ ضرور ہے، مگر مُشتاق و آرزومند بھی ہے۔ یہ زلیخا کا ہاتھ ہے۔ خواب کو چُھو کر دیکھنے والا ہاتھ۔

صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے اُن کے ہاتھوں کی

ایک صاحب طرز ادیب نے، جو سخن فہم ہونے کے علاوہ ہمارے طرفدار بھی ہیں (تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ سُود خوار ہوتا ـــــ کی حد تک) ایک

* رَج کے (پنجابی): جی بھر کے۔

رسالے میں دبی زبان سے یہ شکوہ کیا کہ ہماری شوخیٔ تحریر مسائل حاضرہ کے عکس اور سیاسی سوز و گداز سے عاری ہے۔ اپنی صفائی میں ہم مختصراً اتنا ہی عرض کریں گے کہ طعن و تشنیع سے اگر دوسروں کی اصلاح ہو جاتی تو بارود ایجاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ مولانا رُومی کہ رمز و کنایہ میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں، ایک اندھیری رات کی بات سناتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جنگل بیابان میں ایک بچہ اپنی ماں سے چمٹ کر کہنے لگا کہ امی! اندھیرے میں مجھے ایک کالا دیو نظر آتا ہے اور مارے ڈر کے میری تو گھگی بندھ جاتی ہے۔ ماں نے جواب دیا، بیٹا! تو مرد بچہ ہے۔ خوف کو دل سے نکال دے۔ اب کی دفعہ جیسے ہی وہ دکھائی دے، آگے بڑھ کے حملہ کر دینا۔ وہیں پتا چل جائے گا کہ حقیقت ہے یا محض تیرا وہم۔ بچے نے پوچھا، امی! اگر اس کالے دیو کی امی نے بھی اسے یہی نصیحت کر رکھی ہو تو۔۔۔؟

کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں؟

کچھ دن بعد وہ رسالہ کہ سرخیلِ دانشوراں تھا اور جس میں راقم الحروف کی سیاسی بے حسی و بے رغبتی کی تشخیص کی گئی تھی، نواب کالا باغ کے حکم سے بند کر دیا گیا۔ ہمارے قدردان نے ایک پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے ٹھیکیدار کے ہاں بحیثیت پبلسٹی منیجر ملازمت کر لی۔ فقیر نے بھی یارانِ نامہرباں اور شہرِ بے اماں سے رخصت چاہی اور بوریا بدھنا سنبھال، داتا کی نگری کی راہ لی

او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

"پروفیسر"، "بارے آلو کا کچھ بیاں ہو جائے" اور "بائی فوکل کلب" اسی سفرِ شوق کی یادگار ہیں۔ پڑھنے والوں کو ان کا رنگ مختلف نظر آئے تو یہ زندہ دلانِ لاہو

کا فیضانِ صحبت ہے۔

لوگ کیوں، کب اور کیسے ہنستے ہیں؟ جس دن ان سوالوں کا صحیح صحیح جواب معلوم ہو جائے گا، انسان ہنسنا چھوڑ دے گا۔ رہا یہ سوال کہ کس پر ہنستے ہیں؟ تو اس کا انحصار حکومت کی تاب و رواداری پر ہے۔ انگریز صرف اُن چیزوں پر ہنستے ہیں، جو اُن کی سمجھ میں نہیں آتیں ـــــ پنچ کے لطیفے، موسم، عورت، تجریدی آرٹ۔ اس کے برعکس ہم لوگ اُن چیزوں پر ہنستے ہیں، جو اب ہماری سمجھ میں آگئی ہیں۔ مثلاً انگریز، عشقیہ شاعری، روپیہ کمانے کی ترکیبیں، بنیادی جمہوریت۔

فقیر کی گالی، عورت کے تھپڑ اور مسخرے کی بات سے آزردہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ قولِ فیصل ہمارا نہیں، مولانا عُبید زاکانی کا ہے (از دشنامِ گدایان و سیلیِ زناں و زبانِ شاعراں و مسخرگاں مرنجید)۔ مزاح نگار اس لحاظ سے بھی فائدے میں رہتا ہے کہ اس کی فاش سے فاش غلطی کے بارے میں بھی پڑھنے والے کو یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ ممکن ہے، اس میں بھی تفنن کا کوئی لطیف پہلو پوشیدہ ہو، جو غالباً موسم کی خرابی کے سبب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اس بنیادی حق سے دستبردار ہوئے بغیر، یہ تسلیم کر لینے میں چنداں مضائقہ نہیں کہ ہم زبان اور قواعد کی پابندی کو تکلفِ زائد تصور نہیں کرتے۔ یہ اعترافِ عجز اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ آج کل بعض اہلِ قلم بڑی کوشش اور کاوش سے غلط زبان لکھ رہے ہیں۔ ہاں کبھی کبھار بے دھیانی یا محض آلکس میں صحیح زبان لکھ جائیں تو اور بات ہے۔ بھول چوک کس سے نہیں ہوتی؟

محترم و مکرم جناب شان الحق صاحب حقی نے جس توجّہ اور محبت سے اس مجموعے کے پانچ مضامین کا مطالعہ فرمایا اس کے لیے راقم الحروف ہمہ تن سپاس گزار ہے۔ انھوں نے نہ صرف مفید مشوروں سے سرفراز فرمایا، بلکہ یہ کہہ کر مصنّف کا دل بڑھایا کہ آپ کہیں کہیں گھسے پٹے محاورے استعمال کر جاتے ہیں، مگر آپ کا املا بے حد اوریجینل ہے۔ چنانچہ 'مبدا' کو 'مبدء'، 'پرواہ' کو 'پروا' اور 'وطیرہ' کو 'وتیرہ' لکھنا ہم نے انھیں سے سیکھا۔ اور یہ بھی انھیں سے معلوم ہوا کہ 'عطائی' اور 'طوطا' کا صحیح املا 'اتائی' اور 'توتا' ہے! جوشِ اصلاح میں ہم 'طوائف' کو بھی 'ت' سے لکھنے پر طیار تھے، مگر طوطے والی بات دل کو نہیں لگی۔ اس لیے کہ 'توتے' کو اگر ط سے لکھا جائے تو نہ صرف یہ کہ زیادہ ہرا معلوم ہوتا ہے، بلکہ ط کا دائرہ ذرا ڈھنگ سے بنائیں تو چونچ بھی نظر آنے لگتی ہے۔

اور جھوٹ کیوں بولیں، 'طوائف الملوکی' کا صحیح مفہوم بھی حقی صاحب ہی نے بتایا، ورنہ ہم تو کچھ اور سمجھے بیٹھے تھے۔ عربی و فارسی میں بس اتنی شُد بُد ہے کہ میٹرک تک ہم 'ایضاً' کو کسی بسیار گو شاعر کا تخلص سمجھ کر ہر غزل 'ایضاً' پر اپنا خون کھولاتے رہے۔ یادش بخیر! راہ زن کے لغوی معنی مرزا نے اسی زمانے میں زنِ بازاری بتائے تھے! اور سچ تو یہ ہے کہ جب سے اس کے صحیح معنی معلوم ہوئے ہیں، غالب اور آتش کے مصرعوں 'ہو کر اسیر دابتے ہیں راہ زن کے پاؤں' اور 'ہزار رہ زنِ امّید وار راہ میں ہے' کا سارا لطف ہی جاتا رہا۔ اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے؟

ازبسکہ حقی صاحب تحقیق کے مردِ میداں ہیں، انھیں قدیم الفاظ و واقعات کے علاوہ کوئی اور بات مشکل سے یاد رہتی ہے۔ مثلاً وہ یہ فوراً بتا دیں گے کہ 'تیتن' کب

متروک ہوا۔ اُستاد (غالب) کے کلام میں "آئینہ" کتنی مرتبہ آیا ہے۔ ستم پیشہ ڈومنی نے مغل بچہ کو کس سنہ میں داغِ مفارقت دیا۔ اُستاد کے مکان کا پتا اور بقایا کرایہ کیا تھا۔ لیکن اپنے مکان کا نمبر بتانے کے لیے انھیں بیگم سے تبادلۂ شکوک کرنا پڑتا ہے۔ وہ خود بھی اپنی غیر حاضر دماغی کے لطیفوں کو، سکھوں کے سمجھ کر، خوب محظوظ ہوتے ہیں۔ ایک دن THE ABSENT-MINDED PROFESSOR فلم کی پیشگی بکنگ کے "کیو" میں ملاقات ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں "کیو" سے اس پر بحث کرتے ہوئے گتھم گتھا نکلے، بلکہ نکالے گئے، کہ صحیح لفظ "قمیض" ہے یا "قمیص"۔ مرزا سے رجوع کیا۔ فرمایا "صحیح پہناوا بُشرٹ ہے!" باہر نکلے تو ہم نے اپنی کار کا دروازہ کھولا اور حقی صاحب شکریہ ادا کرتے ہوئے داخل ہوگئے۔ داخل ہی نہیں ہوئے بلکہ اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا۔ اپنے کوٹ کی اندرونی و بیرونی جیبوں کو کھنگالنے کے بعد ہاتھ کی اتفاقی رگڑ سے ہماری پتلون کی جیب کو بھی ٹٹول لیا۔ بالآخر اپنے/اپنی × قمیص/قمیض کی جیب سے ایک چابی برآمد کی۔ پورا زور لگانے کے باوجود یہ چابی نہ لگی تو فرمایا کہ اس ناہنجار ڈرائیور کو ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ کسی اور ورکشاپ میں سروس کرائے جب بھی سروس ہوتی ہے، ایک نئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم نے ہمت کر کے عرض کیا، قصور دراصل ہماری کار کے سوراخ کا ہے، جو آپ کی چابی میں فٹ نہیں ہو رہا۔ چہک کر بولے، ہاں! قصور پر خوب یاد آیا۔ آپ نے ایک جگہ قوتیدگی لکھا ہے۔ یہ مارواڑیوں کی سی اردو آپ نے کہاں سے سیکھی؟ عرض کیا مارواڑ میں، جہاں ہم پیدا ہوئے۔ ہمیں کار سے اُتار کر فٹ پاتھ پہ گلے لگاتے ہوئے بولے، تو گویا اردو آپ کی مادری زبان نہیں ہے! حالانکہ آپ کی

اہلیہ تو اہلِ زبان ہیں!
خدا انھیں خوش رکھے کہ انھوں نے ہماری اردو کی نوک پلک سنوارنے میں ہماری بیگم کا ہاتھ بٹایا ہے۔

۲۶ سی ۲۔ گلبرگ ۳۔ لاہور
۲۴ اکتوبر ۱۹۶۹ء

مشتاق احمد یوسفی

مکرّر آنکہ، رسمِ دنیا، موقع اور دستور تو نہیں، لیکن مقطع میں کچھ ایسی سخن گسترانہ بات آپڑی ہے کہ جناب جمیل احمد قریشی خوشنویس کا قرض اُتارنا لازم ہوگیا۔ چار سال پہلے اِس کتاب کی کتابت کے دوران انھوں نے حاشیہ پر پنسل سے جا بجا اپنے ذاتی تاثرات سے خطِ شکستہ میں آگاہی بخشی (آخر میں تو اوچھے نشانوں پر اُتر آئے تھے: !!?✗✓!) اور نقل کے ساتھ ساتھ کُفر کی نشان دہی بھی کرتے رہتے مثلاً ایک مضمون میں ہم نے اپنے شکار کے سلسلے میں موضع ڈھلم بلگن کا خاکہ اُڑایا تھا۔ انھوں نے مسودہ پر قلم پھیرتے ہوئے حاشیہ پر ارقام فرمایا "مگر یہ تو میرا آبائی گاؤں ہے"۔ اور اس کی جگہ از خود ٹوبہ ٹیک سنگھ جڑ دیا، جہاں غالباً اُن کا سسرال ہے۔ صفحہ ۲۰۷ پر ہم نے لکھا تھا کہ ایک کھیل (FARCE) میں شہنشاہ اکبر نے انارکلی کے رُخِ زیبا پر اس انداز سے طمانچہ مارا کہ ہمیں تو دُور سے یہی لگا کہ مہابلی پانچ منٹ تک انارکلی کا گال سہلاتے رہے۔ جمیل صاحب نے طوعاً و کرہاً کتابت تو کردی لیکن "پانچ منٹ" کے گرد پنسل سے دائرہ کھینچ کر حاشیہ پر اسے نازیبا قرار دیا۔

اِس اعتراض کے پیشِ نظر ہم نے پانچ منٹ کے بجائے دو منٹ کر دیا ہے۔ ۱۹۶۵ کی کتابت میں کچھ حصے، کتابت کے لحاظ سے خاصے کمزور تھے۔ انھیں ہم نے نکال دیا۔ پھر جمیل صاحب نے چُن چُن کر وہ اوراق علیحدہ کیے جو اُن کے نزدیک بلحاظِ انشا پردازی خاصے کمزور تھے۔ جب دونوں مرحلے بخیر و خوبی اختتام کو پہنچے تو پتا چلا کہ کتاب میں کچھ باقی نہیں رہا، سوائے دیباچہ کے! وہ بھی اس لیے کہ ابھی لکھا نہیں گیا تھا۔

چنانچہ جگرِ لخت لخت کو پھر جمع کیا۔ جون ۱۹۶۹ میں ساری کتاب کی دوسری مرتبہ بصرفِ کثیر کتابت شروع ہوئی * جس کا عکسِ جمیل پیشِ خدمت ہے۔

جمیل صاحب نے حسبِ وعدہ چشم پوشی فرمائی۔ لیکن ہم نے بھی اس دفعہ مسودے اور آفسٹ پر حاشیہ بالکل نہیں چھوڑا تھا۔

یوسفی

---

* عرضِ جمیل: مصنف کو اب بھی حواشی سے اختلاف ہے تو بندہ تیسری دفعہ کتابت کرنے کے لیے تیار ہے۔

جمیل عفی عنہ خوشنویس نمبر رقم
(بقلم خود)

صبغے اینڈ سنز

سوداگران و ناشران کتب

یہ اُس پُراُمید زمانے کا ذکر ہے، جب انھیں کتابوں کی دکان کھولے اور ڈیل کارنیگی پڑھے دو تین مہینے ہوئے ہوں گے اور جب ان کے ہونٹوں پر ہر وقت وہ ڈھلی منجھی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی، جو آج کل صرف ٹوتھ پیسٹ کے اشتہاروں میں نظر آتی ہے۔ اس زمانے میں ان کی باتوں میں وہ اڑ کر لگنے والا جوش اور ولولہ تھا جو بالعموم انجام سے بے خبر سٹے بازوں اور نومسلموں سے منسوب کیا جاتا ہے۔

دکان کیا تھی، کسی بگڑے ہوئے رئیس کی لائبریری تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے چُن چُن کر وہی کتابیں دکان میں رکھی ہیں، جو خود ان کو پسند تھیں اور جن کے متعلق انھوں نے ہر طرح اپنا اطمینان کر لیا تھا کہ بازار میں ان کی کوئی مانگ ہے نہ کھپت۔ ہمارے دوست مرزا عبدالودود بیگ نے دکان میں قدم رکھتے ہی اپنی تمام ناپسندیدہ کتابیں اس خوش سلیقگی سے یکجا دیکھیں تو ایک دفعہ اپنی پرانی عینک پر اعتبار نہیں آیا اور جب اعتبار آ گیا تو اُلٹا پیار آنے لگا۔ اپنے مخصوص کھٹ مٹھے لہجے میں بولے "یار! اگر عام پسند کی بھی دو چار کتابیں رکھ لیتے تو گاہک دکان سے اس طرح نہ جاتے، جیسے سکندر دنیا سے گیا تھا ——— دونوں ہاتھ خالی!"

تاجرانہ تبسم کے بعد فرمایا "میں صرف معیاری کتابیں بیچتا ہوں۔"

پوچھا "معیاری کی کیا پہچان؟"

ارشاد ہوا "سنو! میرے ایک قریبی ہمسایے ہیں۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس۔ چوبیس گھنٹے کتابوں میں جُٹے رہتے ہیں۔ لہٰذا میں نے کیا یہ کہ دُکان کھولنے سے پہلے ان سے ان کی اپنی پسندیدہ کتابوں کی مکمل فہرست بنوالی۔ پھر ان کتابوں کو چھوڑ کر اردو کی بقیہ تمام کتابیں خرید کے دکان میں سجادیں۔ اب اس سے بہتر انتخاب کوئی کر کے دکھا دے"۔

پھر ایکا ایکی تاجرانہ لہجہ بنا کر صیغہ جمع میں بنکارے "ہماری کتابیں اُردو ادب کی آبرو ہیں"۔

"اور ہم یہ بہت ارزاں بیچتے ہیں!" مرزا نے اسی لہجے میں جملہ پورا کیا۔

مصیبت یہ تھی کہ ہر کتاب، ہر مصنف کے متعلق ان کی اپنی رائے تھی۔ بے لاگ اور اٹل بھی جس کا اظہار و اعلان بالجہر وہ بمنزلہ دینی فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ انھوں نے گاہک کو کتاب خریدنے سے جبراً باز رکھا کہ اس سے اس کا ادبی ذوق خراب تر ہونے کا اندیشہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کتب فروش کم اور کتب نما زیادہ تھے۔ کبھی کوئی خریدار ہلکی پھلکی کتاب مانگ بیٹھتا تو بڑی شفقت سے جواب دیتے "یہاں سے دو گلیاں چھوڑ کر سیدھے ہاتھ کو مڑ جائیے۔ پرلے نکڑ پر چوڑیوں کی دُکان کے پاس ایک لیٹر بکس نظر آئے گا۔ اس کے ٹھیک سامنے جو اُونچی سی دکان ہے۔ بچوں کی کتابیں وہیں ملتی ہیں"۔ ایک مرتبہ کا واقعہ اب تک یاد ہے کہ ایک صاحب کلیاتِ مومن پوچھتے ہوئے آئے اور چند منٹ بعد مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کی نظموں کا گلدستہ ہاتھ میں لیے ان کی دُکان سے نکلے۔

ایک دن میں نے پوچھا اختر شیرانی کی کتابیں کیوں نہیں رکھتے؟ مسکرائے فرمایا وہ نابالغ شاعر ہے۔ میں سمجھا شاید MINOR POET کا وہی مطلب سمجھتے ہیں۔ میری

حیرانی دیکھ کر خود ہی وضاحت فرمادی کہ وہ وصل کی اس طور پر فرمائش کرتا ہے گویا کوئی بچہ ٹافی مانگ رہا ہے۔ اس پر میں نے اپنے ایک محبوب شاعر کا نام لے کر کہا کہ بچارے ہوش ملیح آبادی نے کیا خطا کی ہے؟ ان کے مجموعے بھی نظر نہیں آتے۔ ارشاد ہوا کہ اس ظالم کے تقاضائے وصل کے یہ تیور ہیں گویا کوئی کابلی پٹھان ڈانٹ ڈانٹ کر ڈوبی ہوئی رقم وصول کر رہا ہے۔ میں نے کہا مگر وہ زبان کے بادشاہ ہیں۔ بولے ٹھیک کہتے ہو۔ زبان اُن کے گھر کی لونڈی ہے اور وہ اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے ہیں! عاجز ہو کر میں نے کہا اچھا، یُوں ہی سہی، مگر فانی بدایونی کیوں غائب ہیں؟ فرمایا ہش! وہ نرے مصوّرِ غم ہیں! میں نے کہا بجا! مگر مہدی الافادی تو کامل انشا پرداز ہیں۔ بولے چھوڑو بھی! فانی مصوّرِ غم ہیں تو مہدی مصوّرِ بنتِ عم! واللہ! وہ انشائیہ نہیں، نسائیہ لکھتے ہیں۔ بالآخر میں نے ایک جانے پہچانے پروفیسر نقّاد کا نام لیا، مگر پتہ چلا کہ انھوں نے اپنے کانوں سے فاضل پروفیسر کے والدِ بزرگوار کو لکھنؤ کو نکھلئو اور مزاج شریف کو مجاز شریف کہتے سنا تھا۔ چنانچہ اس بدلسانہ نا اہلی کی بنا پر ان کے تنقیدی مضامین دُکان میں کبھی بار نہ پا سکے۔ یہی نہیں، خود پروفیسر موصُوف نے ایک محفل میں ان کے سامنے غالب کا ایک مشہور شعر غلط پڑھا اور دوہرے ہو ہو کر داد وصُول کی، سو الگ! میں نے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بولے فرق کی ایک [illegible] ہی رہی! امیرن صاحب کا قصّہ بھول گئے؟ کسی نے ان کے سامنے غالب کا شعر غلط پڑھ دیا۔ تیوریاں چڑھا کر بولے، میاں! یہ کوئی قرآن و حدیث ہے۔ جیسے چاہا، پڑھ دیا۔

آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ بہت سی کتابیں وہ اس لیے نہیں رکھتے تھے کہ ان کو سخت ناپسند تھیں اور ان کے مصنّفین سے وہ کسی نہ کسی موضوع پر ذاتی اختلاف رکھتے تھے لیکن معدودے چند مصنّفین جو اس معتوب و مغضوب زمرے سے خارج تھے، ان

کی کتابیں دُکان میں رکھتے ضرور تھے، مگر کوشش یہی ہوتی کہ کسی طرح بِکنے نہ پائیں کیونکہ وہ انھیں بے حد پسند تھیں اور انھیں سنگوا سنگوا کر رکھنے میں عجیب روحانی لذّت محسوس کرتے تھے۔ پسند و ناپسند کی اس غیر تاجرانہ کشاکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ

کتب از جا نہ جُنبند!

سُنی سنائی نہیں کہتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دیوانِ غالبؔ (مصوّر) دکان میں مہینوں پڑا رہا محض اِس وجہ سے کہ ان کا خیال تھا کہ دکان اس کے بغیر سُونی سُونی معلوم ہوگی۔ مرزا کہا کرتے تھے کہ ان کی مثال اس بدنصیب قصاب کی سی ہے، جسے بکروں سے عشق ہو جائے۔

کتابوں سے عشق کا یہ حال تھا کہ عین بوہنی اور بِکری کے اوقات میں بھی مطالعے میں کمر کمر غرق رہتے۔ یہ کمر کمر کی قید اس لیے لگانا پڑی کہ ہم نے آج تک انھیں کوئی کتاب پُوری پڑھتے نہیں دیکھا۔ مرزا اسی بات کو یُوں کہتے تھے کہ بہت کم کتابیں ایسی ہیں جو اپنے کو ان سے پڑھوا سکی ہیں۔ یہی نہیں، اپنے مطالعے کی تکنیک کے مطابق رُومانوی اور جاسُوسی ناولوں کو ہمیشہ اُلٹا یعنی آخر سے پڑھتے تاکہ ہیروئن کا حشر اور قاتل کا نام فوراً معلوم ہو جائے۔ (ان کا قول ہے کہ معیاری ناول وہی ہے جو اس طرح پڑھنے پر بھی آخر سے شروع تک دلچسپ ہو۔) ہر کہیں سے دو تین صفحے اُلٹ پلٹ کر پُوری کتاب کے متعلق بے دریغ رائے قائم کر لینا اور پھر اسے منوانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بعض اوقات تو لکھائی چھپائی دیکھ کر ہی ساری کتاب کا مضمون بھانپ لیتے۔ مجھے یاد ہے کہ اردو کی ایک تازہ چھپی ہُوئی کتاب کا کاغذ اور روشنائی سُونگھ کر نہ صرف اسے پڑھنے بلکہ دُکان میں رکھنے سے بھی انکار کر دیا۔ ان کے دُشمنوں نے اُڑا رکھی تھی کہ وہ کتاب کا سرورق پڑھتے پڑھتے اُونگھنے لگتے ہیں اور

اس عالمِ کشف میں جو کچھ دماغ میں آتا ہے، اس کو مصنّف سے منسوب کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے بیزار ہو جاتے ہیں۔

اور مصنّف غریب کس شمار قطار میں ہیں۔ اپنے ادبی قیاس و قیافے کا ذکر کرتے ہوئے ایک دن یہاں تک ڈینگ مارنے لگے کہ میں آدمی کی چال سے بتا سکتا ہوں کہ وہ کس قسم کی کتابیں پڑھتا رہا ہے۔ اتفاق سے اُس وقت ایک بھرے بھرے پچھلتے والی لڑکی دکان کے سامنے سے گزری۔ چینی قمیض اُس کے بدن پر چُست فقرے کی طرح کسی ہوئی تھی۔ سر پہ ایک ربن سلیقے سے اوڑھے ہوئے، جسے میں ہی کیا، کوئی بھی شریف آدمی، دوپٹہ نہیں کہہ سکتا —— اس لیے کہ دوپٹہ کبھی اتنا بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ تنگ موری اور تنگ تر گھیر کی شلوار۔ چال اگرچہ کڑی کمان کا تیر نہ تھی، لیکن کہیں زیادہ مُہلک۔ کمان کتنی بھی اُتری ہوئی کیوں نہ ہو، تیر لامحالہ سیدھا ہی آئے گا۔ ٹھمک ٹھمک کر نہیں، لیکن وہ قتالۂ عالم قدم آگے بڑھانے سے پہلے ایک دفعہ جسم کے درمیانی حصّے کو گھنٹے کے پنڈولم کی طرح دائیں بائیں یُوں ہلاتی کہ بس چُھری سی چل جاتی۔ نتیجہ یہ کہ متذکرہ حصّۂ جسم نے جتنی مسافت جنوب سے شمال تک طے کی، اُتنی ہی مشرق سے مغرب تک۔ مختصر یُوں سمجھیے کہ ہر گام پر ایک قدِ آدم صلیب (✝) بناتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

"اچھا، بتاؤ، اس کی چوکھی چال سے کیا ٹپکتا ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"اس کی چال سے تو بس اس کا چال چلن ٹپکے ہے" مجھے آنکھ مار کر لہکتے ہوئے بولے۔

"پھر وہی بات! چال سے بتاؤ، کیسی کتابیں پڑھتی رہی ہے؟" میں نے بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔

"پگلے! یہ تو خود ایک کتاب ہے!" انھوں نے شہادت کی اُنگلی سے سڑک پر اُن خوانندگان کی طرف اشارہ کیا جو ایک فرلانگ سے اس کے پیچھے پیچھے فہرستِ مضامین کا مُطالعہ کرتے چلے آرہے تھے۔

دیکھا گیا ہے کہ وہی کتب فروش کامیاب ہوتے ہیں جو کتاب کے نام اور قیمت کے علاوہ اور کچھ جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کی ناواقفیتِ عامہ جس قدر وسیع ہوگی، جس قدر عمیق اور رنگا رنگ ہوگی، اُتنی ہی بھرپور خود اعتمادی اور معصوم گمراہی کے ساتھ وہ بُری کتاب کو اچھا کرکے بیچ سکیں گے۔ اس کے برعکس کتابیں پڑھتے پڑھتے (اَدھوری ہی سہی) ہمارے ہیرو کو اسلامی ناولوں کے جو شیلے مکالمے حفظ ہو گئے تھے اور بغدادی جم خانے میں کبھی دیسی وہسکی کی زیادتی سے موصوف پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی تو دشمنانِ اسلام پر گھونسے تان تان کر تڑاق پڑاق ایسے ڈائیلاگ بولتے جن سے شوقِ شہادت، اس طرح ٹپکتا پڑتا تھا کہ بیرون تک کا ایمان تازہ ہو جاتا۔

مسلسل ورق گردانی کے سبب نئی نویلی کتابیں اپنی کنواری کراری مہک اور جلد کی کساوٹ کھو چکی تھیں۔ بیشتر صفحات کے کونے کُتّے کے کانوں کی طرح مُڑ گئے تھے اور بعض پسندیدہ اوراق کی یہ کیفیت تھی کہ

جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا

اور لشکر بھی وہ جو خُون کی بجائے پیک کی چھینٹیں اڑاتا ہوا گزر جائے! ایک مرتبہ اُن کو بھری دکان میں اپنے ہی سائز کے ایک اسلامی ناول کا عطر نکالتے دیکھا تو مرزا نے ٹوکا — "لوگ اگر کسی حلوائی کو مٹھائی چکھتے دیکھ لیں تو اس سے مٹھائی خریدنی چھوڑ دیتے ہیں اور ایک تم ہو کہ ہر آئے گئے کے سامنے کُتب چَشی کرتے رہتے ہو!"

پھر کیا تھا، پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ پھٹ پڑے "کتب فروشی ایک علم ہے، برخوردار! ہمارے ہاں نیم جاہل کتابیں لکھ سکتے ہیں، مگر بیچنے کے لیے باخبر ہونا ضروری ہے بعینہٖ اسی طرح جیسے ایک اندھا سُرمہ بنا سکتا ہے، مگر بیچ بازار میں کھڑے ہو کر بیچ نہیں سکتا۔ میاں! تم کیا جانو، کیسے کیسے جیّد جاہل سے پالا پڑتا ہے۔ (اپنی عزیز ترین کتاب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے) جی میں آتی ہے، دیوانِ غالب (مع مقدّمہ مولٰنا امتیاز علی عرشی) ان کے سر پر دے ماروں۔ تمھیں یقین نہیں آئے گا۔ دو ہفتے ہونے کو آتے۔ ایک مظلوم صورت کلرک یہاں آیا اور مجھے اس کونے میں لے جا کر کچھ شرماتے، کچھ لجاتے ہوئے کہنے لگا کہ کرشن چندر ایم اے کی وہ کتاب چاہیے، جس میں "تیری ماں کے دُودھ میں حُکم کا اِکّا" والی گالی ہے۔ خیر، اسے جانے دو کہ اس بچارے کو دیکھ کر واقعی محسوس ہوتا تھا کہ یہ گالی سامنے رکھ کر ہی اس کی صورت بنائی گئی ہے۔ مگر ان صاحب کو کیا کہو گے جو نئے نئے اردو کے لیکچرر مقرّر ہوئے ہیں۔ میرے واقف کار ہیں۔ اسی مہینے کی پہلی تاریخ کو کالج سے پہلی تنخواہ وصول کر کے سیدھے یہاں آئے اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ لگے پُوچھنے، صاحب! آپ کے ہاں منٹو کی وہ کتاب بھی ہے، جس میں "دھرن تختہ" کے معنے ہوں؟ اور ابھی پرسوں کا ذکر ہے۔ ایک محترمہ تشریف لائیں۔ سن یہی اٹھارہ اُنّیس کا۔ نکلتا ہوا فربہ بدن۔ اپنی گڑیا کی چولی پہنے ہوئے تھیں۔ دونوں ہتھیلیوں کی رِحل بنا کر اس پر اپنا کتابی چہرہ رکھا اور لگیں کتابوں کو ٹکر ٹکر دیکھنے۔ اسی جگہ جہاں تم کھڑے ہو۔ پھر دریافت کیا، کوئی ناول ہے؟ میں نے راتوں کی نیند حرام کرنے والا ایک ناول پیش کیا۔ رِحل پر سے بولیں، یہ نہیں، کوئی ایسا دلچسپ ناول دیجیے کہ رات کو پڑھتے ہی نیند آجائے۔ میں نے ایک ایسا ہی غشی آور ناول نکال کر دیا۔ مگر وہ بھی نہیں جچا۔ در اصل اُنھیں کسی

گھیرے سبز گرد پوش والی کتاب کی تلاش تھی، جو ان کی خواب گاہ کے سُرخ پردوں سے "میچ" ہو جائے۔ اس سخت معیار پر صرف ایک کتاب پوری اتری۔ وہ تھی "اُستاد موٹر ڈرائیوری" (منظوم) جس کو دراصل اردو زبان میں خودکشی کی آسان ترکیبوں کا پہلا منظوم ہدایت نامہ کہنا چاہیے۔

میں نے نوخیز خاتون کی حمایت کی "ہمارے ہاں اردو میں ایسی کتابیں بہت کم ہیں جو بغیر گرد پوش کے بھی اچھی لگیں۔ گرد پوش تو ایسا ہی ہے، جیسے عورت کے لیے کپڑے۔"

"مگر ہالی وُڈ میں آج کل زیادہ تر ایکٹرسیں ایسی ہیں جو اگر کپڑے پہن لیں تو ذرا بھی اچھی نہ لگیں"۔ مرزا نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

لیکن نیا نیا شوق تھا اور ابھی یہ نوبت نہیں آئی تھی کہ ایسے واقعات سے ان کی طبیعت سچ مچ مکدر ہو جائے۔ ڈیل کارنیگی کے مشورے کے مطابق وہ ہر وقت مُسکراتے رہتے اور ہم نے سوتے میں بھی ان کی باچھیں بطور خیر سگالی کھلی ہوئی ہی دیکھیں۔ اس زمانے میں بقول مرزا، وہ چھوٹا دیکھتے نہ بڑا، ہر کس و ناکس کے ساتھ ڈیل کارنیگی کیا کرتے تھے۔ حد یہ کہ ڈاکیا اگر بیرنگ خط بھی لاتا تو انعام و اکرام دے کر رخصت کرتے۔ گاہکوں کو تو ذاتی مہمان سمجھ کر بچھ بچھ جاتے اور اکثر متاعِ سخن کے ساتھ (اور کبھی اس کے بغیر ہی) خود بھی بک جاتے۔ سچ ہے، خوش خلقی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں دکان چل نکلی، مگر دکانداری ٹھپ ہو گئی۔ یہ صورتِ تضاد اس طرح پیدا ہوئی کہ دکان پر اب ان قدردانوں کی ریل پیل رہنے لگی، جو اصل میں ان سے کوکا کولا پینے یا فون کرنے آتے اور لوٹتے میں ایک آدھ کتاب عاریتاً لے کر ٹلتے۔ جس گاہک سے خصوصیت برتتے، اس کی پیشوائی کو بے تحاشا دوڑتے ہوئے سڑک کے اس پار جاتے۔ پھر اسے اپنے اُونچے سے اسٹول پر بٹھا کر فوراً دوسرے گاہک کو چالیس قدم تک رخصت کرنے چلے جاتے۔ ہر دو

رسُوم کی پُر تکلف ادائیگی کے دوران دُکان کسی ایک گاہک یا گروہ کی اجتماعی تحویل میں رہتی۔ نتیجہ؟ کتابوں کی قطاروں میں جا بجا کھانچے پڑ گئے۔ جیسے دانت ٹوٹ گئے ہوں ـــــــ ان کے اپنے بیان کے مطابق ایک نئے گاہک کو (جس نے ابھی ابھی "غبارِ خاطر" کا ایک نسخہ ادھار خریدا تھا) پاس والے ریستوران میں مصنّف کی من بھاتی چینی چائے پلانے لے گئے۔ حلفیہ کہتے تھے کہ مشکل سے ایک گھنٹہ وہاں بیٹھا ہوں گا، مگر واپس آکر دیکھا تو نور اللغات کی چوتھی جلد کی جگہ خالی تھی۔ ظاہر ہے کہ کسی بے ایمان نے موقع پاتے ہی ہاتھ صاف کر دیا۔ انھیں اس کی جگہ فسانۂ آزاد کی چوتھی جلد رکھنا پڑی اور آخر کو یہی سیٹ چاکسُو کالج لائبریری کو بذریعہ وی۔ پی سپلائی کیا۔

چوریاں بڑھتی دیکھ کر ایک بزرگوار نے جو یومِ افتتاح سے دُکان پر اُٹھتے بیٹھتے تھے (بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ صرف بیٹھتے تھے، اس لیے کہ ہم نے ان کو کبھی اُٹھتے نہیں دیکھا) مال کی ناجائز "نکاسی" روکنے کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ ایک تعلیم یافتہ مگر ایماندار منیجر رکھ لیا جائے۔ ہر چند کہ اُن کا روئے سخن اپنی ہی طرف تھا، لیکن ایک دوسرے صاحب نے (جو نیر سے صاحبِ دیوان تھے اور روزانہ اپنے دیوان کی بکری کا حال پُوچھنے آتے اور رارد دکے مستقبل سے مایوس ہو کر لوٹتے تھے) خود کو اس اسامی کے لیے پیش ہی نہیں کیا، بلکہ شام کو اپنے گھر واپس جانے سے بھی انکار کر دیا ـــــــ یہی صاحب دُوسرے دن سے خزانچی جی کہلائے جانے لگے۔ صورت سے سزا یافتہ معلوم ہوتے تھے اور اگر واقعی سزا یافتہ نہیں تھے تو یہ پولیس کی عین بھلمنساہٹ تھی۔ بہر حال یہاں ان کی ذات سے خیانتِ مجرمانہ کا کوئی خدشہ نہ تھا، کیونکہ دکان کی ساری بکری مدتوں سے اُدھار پہ ہو رہی تھی۔ یوں تو دکان میں پہلے ہی دن سے "آج نقد کل اُدھار" کی ایک چھوڑ تین تین تختیاں لگی تھیں، مگر ہم دیکھتے

چلے آئے تھے کہ وہ کل کا کام آج ہی کر ڈالنے کے قائل ہیں۔ پھر یہ کہ قرض پر کتابیں بیچنے پر ہی اکتفا کرتے تو صبر آجاتا۔ لیکن آخر آخر میں یہاں تک سننے میں آیا کہ بعض گاہک ان سے نقد روپے قرض لے کر پاس والی دکان سے کتابیں خریدنے لگے ہیں۔

میں موقع کی تلاش میں تھا، لہٰذا ایک دن تخلیہ پاکر انھیں سمجھایا کہ بندۂ خدا! اگر قرض ہی دینا ہے تو بڑی رقم قرض دو تاکہ لینے والے کو یاد رہے اور تمھیں تقاضا کرنے میں شرم نہ آئے۔ یہ چھوٹے چھوٹے قرضے دے کر خلقِ خدا کے ایمان اور اپنے اخلاق کی آزمائش کاہے کو کرتے ہو؟ میری بات ان کے دل کو لگی۔ دوسرے ہی دن خزانچی جی سے نادہند خریداروں کی مکمل فہرست حروفِ تہجّی کے اعتبار سے مرتّب کرائی اور پھر خود اسی ترتیب سے اُدھار وصول کرنے کا پنج روزہ منصوبہ بنا ڈالا، لیکن 'الف' ہی کی ردیف میں ایک ایسا ناہنجار آن پڑا کہ چھ مہینے تک 'ب' سے شروع ہونے والے ناموں کی باری نہیں آئی۔ میں نے یہ نقشہ دیکھا تو پھر سمجھایا کہ جب یہ حضرات تمھارے پاس حروفِ تہجّی کی ترتیب سے قرض لینے نہیں آئے تو تم اس ترتیب سے وصول کرنے پر کیوں اَڑے ہوئے ہو؟ سیدھی سی بات تھی مگر وہ منطق پر اُتر آئے۔ کہنے لگے، اگر دوسرے بے اصول ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بھی بے اصولا ہو جاؤں۔ دیکھتے نہیں، اسکول میں حاضری کے وقت بچّوں کے نام حروفِ تہجّی کی ترتیب سے پکارے جاتے ہیں، مگر بچّوں کو اسی ترتیب سے پیدا یا پاس ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ بولتے کیوں نہیں؟

اِس کے باوجود میری نصیحت کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ اب کتاب ادھار نہیں بیچتے تھے، تحفۃً دے دیا کرتے تھے۔ کہتے تھے جب رقم ڈوبنی ہی ہے تو پھر ثواب سے بھی کیوں محروم رہوں؟ ادھر کچھ عرصے سے انھوں نے بھی کھلتے لکھنا بھی چھوڑ دیا تھا جس کا یہ معقول

جو از پیش کرتے کہ میں نقصانِ مایہ میں جان کے زیاں کا اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ مرزا نے یہ لُٹس مچتی دیکھی تو ایک دن پُوچھا :

"آج کل تم حکومت کے فرائض کیوں انجام دے رہے ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"تم نے قوم کی مفت تعلیم کا ذمّہ کیوں لے رکھا ہے؟"

اب اُن کے چہرے پر دانائی کی وہ چھُوٹ پڑنے لگی جو عمُوماً دِوالہ نکلنے کے بعد طلُوع ہوتی ہے۔ مرزا کا خیال ہے کہ جب تک دو تین دفعہ دِوالہ نہ نکلے، آدمی کو دُکان داری کا سلیقہ نہیں آتا۔ چنانچہ اس مبارک بربادی کے بعد وہ بُجھ سے گئے اور ہر شے میں اپنی کمی محسوس کرنے لگے۔ وہ دائمی (BUILT-IN) مسکراہٹ بھی غائب ہو گئی اور اب وہ بھُول کر کسی گاہک سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔ مبادا وہ ادھار مانگ بیٹھے۔ اکثر دیکھا کہ جوں ہی گاہک نے دکان میں قدم رکھّا اور انھوں نے گھُرک کر پُوچھا "کیا چاہیے؟" ایک دن میں نے دربڑایا "اندھے کو بھی نظر آتا ہے کہ کتابوں کی دکان ہے۔ پھر تم کیوں پُوچھتے ہو، کیا چاہیے؟ کیا چاہیے؟" فرمایا "کیا کرُوں، بعضے بعضے کی صورت ہی ایسی ہوتی ہے کہ یہ پُوچھنا پڑتا ہے"۔

کتابیں رکھنے کے گناہگار ضرُور تھے۔ طوعاً وکرہاً بیچ بھی لیتے تھے۔

لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

ان کے نک چڑھے پن کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص پُوچھتا ہوا آیا "لُغت ہے؟" 'لُغَت' کا تلفظ اس نے 'لُطف' کے وزن پر کیا۔ انھوں نے نتھنے پھُلا کر جواب دیا "اسٹاک میں نہیں ہے"۔ وہ چلا گیا تو میں نے کہا "یہ سامنے رکھی

تو ہے، تم نے انکار کیوں کر دیا؟" کہنے لگے "یہ؟ یہ تو لغت ہے۔ پھر یہ بھی کہ اس بچارے کا کام ایک لغت سے تھوڑا ہی چلے گا!" ہاں تلفظ پر یاد آیا کہ اس دورِ ابتلا میں انھوں نے دکان میں ایک ازکار رفتہ ریڈیو رکھ لیا تھا۔ اسی کو گود میں لیے گھنٹوں گڑگڑاہٹ سنا کرتے تھے، جیسے وہ مختلف ملکوں کے موسم کا حال کہا کرتے تھے۔ بعد میں مرزا کی زبانی غایتِ سمع خراشی یہ معلوم ہوئی کہ اس ریڈیائی دمے کی بدولت کم از کم گاہکوں کی غلط اردو تو سنائی نہیں دیتی۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ کتب فروشوں کو ہر کتاب پر اوسطاً تیس چالیس فی صد کمیشن ملتا ہے۔ بلا کد و کاوش۔ جس پیشے میں منافع کی یہ شرح عام ہو، اس میں دِلدر نکالنے کے لیے غیر معمولی دل و دماغ درکار ہیں۔ اور وہ ایسے ہی دل و دماغ کے مالک نکلے۔ اپنی حسابی صلاحیتوں کا دستاویزی ثبوت وہ اس زمانے ہی میں دے چکے تھے، جب سہ ماہی امتحان کی کاپی میں وہ اپنا نام "شیخ صبغت اللہ" لکھتے اور غیر سرکاری طور پر محض "صبغے" کہلاتے تھے۔ اُسی زمانے سے وہ اپنے اس عقیدے پر سختی سے قائم ہیں کہ علم الحساب درحقیقت کسی متعصب کافر نے مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے لیے ایجاد کیا تھا۔ چنانچہ ایک دن یہ خبر سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ رات ان پر علم الحساب ہی کے کسی قاعدے کی رُو سے یہ منکشف ہوا ہے کہ اگر وہ کتابیں نہ بیچیں (دکان ہی میں پڑی سڑنے دیں) تو نوّے فی صد منافع ہو گا۔ منافع کی یہ اندھا دھند شرح سن کر مرزا کے بھی منہ میں پانی بھر آیا۔ لہٰذا نزدیک ترین گلی سے صبغے کے پاس وہ گُر معلوم کرنے پہنچے، جس کی مدد سے وہ بھی اپنی پرانے کوٹوں کی دکان میں تالہ ٹھوک کر فی الفور اپنے دلدّر دور کر لیں۔

صبغے نے کان میں لگی ہوئی پنسل کی مدد سے اپنے فارمولے کی جو تشریح کی اُس

کا لبِ لباب سلیس اردو میں یہ ہے کہ اب تک ان کا یہ معمول رہا کہ جس دن نئی کتابیں خرید کر دُکان میں لگاتے، اسی دن اُن پر ملنے والے چالیس فی صد منافع کا حساب (قریب ترین پائی تک) لگا کر خرچ کر ڈالتے۔ لیکن جب یہ کتابیں سال بھر تک دکان میں پڑی بھنکتی رہتیں تو "کرسمس سیل" میں ان گنج ہائے گراں مایہ کو پچاس فی صد رعایت پر فروخت کر ڈالتے اور اس طرح اپنے حساب کی رُو سے ہر کتاب پر نوّے فی صد ناجائز نقصان اٹھاتے۔ لیکن نیا فارمولا دریافت ہونے کے بعد اب وہ کتابیں یکسر فروخت ہی نہیں کریں گے، لہٰذا اپنی اس حکمتِ بے عملی سے نوّے فی صد نقصان سے صاف بچ جائیں گے اور یہ منافع نہیں تو اور کیا ہے؟

کتب فروشی کے آخری دور میں جب ان پر پیمبری وقت پڑا تو ہر ایک گاہک کو اپنا مالی دشمن تصوّر کرتے اور دکان سے اس کے خالی ہاتھ جانے کو اپنے حق میں باعثِ خیر و برکت گردانتے۔ ہفتے کو میرا دفتر ایک بجے بند ہو جاتا ہے۔ واپسی میں یُوں ہی خیال آیا کہ چلو آج صبغے کی دُکان میں جھانکتا چلوں۔ دیکھا کہ وہ اونچے اسٹول پر پیر لٹکائے اپنے قرضداروں کی فہرستوں سے ٹیک لگائے سو رہے ہیں۔ میں نے کھنکار کر کہا:

"قیلولہ ——— ؟"

"اسٹاک میں نہیں ہے!" آنکھیں بند کیے کیے بولے۔

یہ کہہ کر ذرا گردن اٹھائی۔ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اپنی داہنی ہتھیلی دیکھی اور پھر سو گئے۔

داہنی ہتھیلی دیکھنا ان کی بڑی پرانی عادت ہے جسے زمانۂ طالب علمی کی یادگار کہنا چاہیے۔ ہوتا یہ تھا کہ دن بھر خوار و خستہ ہونے کے بعد وہ رات کو ہوسٹل میں کسی نہ

کسی کے سر ہو جاتے کہ صبح تمہارا منہ دیکھا تھا۔ چنانچہ ان کے کمرے کے ساتھی اپنی بدنامی کے خوف سے صبح دس بجے تک لحاف اوڑھے پڑے رہتے اور کچھوے کی طرح گردن نکال نکال کر دیکھتے رہتے کہ صبغے دفعان ہوئے یا نہیں۔ جب اپنے بیگانے سب آئے دن کی نحوستوں کی ذمہ داری لینے سے یوں منہ چھپانے لگے تو صبغے نے ایک ہندو نجومی کے مشورے سے یہ عادت ڈالی کہ صبح آنکھ کھلتے ہی شگون کے لیے اپنی دائیں ہتھیلی دیکھتے اور دن بھر اپنے آپ پر لعنت بھیجتے رہتے۔ پھر تو یہ عادت سی ہو گئی کہ نازک و فیصلہ کن لمحات میں مثلاً اخبار میں اپنا رول نمبر تلاش کرتے وقت، تاش پھینٹنے کے بعد اور کرکٹ کی گیند پر ہٹ لگانے سے پہلے، ایک دفعہ اپنی داہنی ہتھیلی ضرور دیکھ لیتے تھے۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے، ان دنوں ان کو اپنی ہتھیلی میں ایک حسینہ صاف نظر آ رہی تھی جس کا جہیز بمشکل ان کی ہتھیلی میں سما سکتا تھا۔

الماریوں کے ان گنت خانے جو کبھی ٹھساٹھس بھرے رہتے تھے، اب خالی ہو چکے تھے —— جیسے کسی نے بھٹے کے دانے نکال لیے ہوں۔ مگر صبغے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والے نہیں تھے۔ چنانچہ اکثر دیکھا کہ ظہر سے عصر تک شیشے کے شوکیس کی فرضی اوٹ میں اپنے خلیرے چچیرے بھائیوں کے ساتھ سر جوڑے فلش کھیلتے رہتے۔ ان کا خیال تھا کہ جوا اگر قریبی رشتہ داروں کے ساتھ کھیلا جائے تو کم گناہ ہوتا ہے۔ رہی دکان داری تو وہ ان حالوں کو پہنچ گئی تھی کہ تاش کے پتوں کے سوا اب دکان میں کاغذ کی کوئی چیز نہیں بچی تھی۔ گاہکوں کی تعداد اگرچہ تگنی چوگنی ہو گئی، مگر مول تول کی نوعیت قدرے مختلف! ہوتے ہوتے جب یہ نوبت آ گئی کہ راہ چلنے والے بھی بھاؤ تاؤ کرنے لگے تو خزانچی جی نے نہائی گتے پر ایک نوٹس نہایت پاکیزہ خط میں آویزاں کر دیا:

"یہ فرنیچر کی دُکان نہیں ہے"

یاد رہے کہ ان کی نصف زندگی ان لوگوں نے تلخ کردی جو قرض پر کتابیں لے جاتے تھے اور بقیہ نصف زندگی ان حضرات نے تلخ کر رکھی تھی جن سے وہ خود قرض لیے بیٹھے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی تباہی میں کچھ شائبہ خوبیِ تقدیر بھی تھا۔ قدرت نے ان کے ہاتھ میں کچھ ایسا جس دیا تھا کہ سونے کو ہاتھ لگائیں تو مٹی ہو جائے لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو ان کی بربادی کا سہرا قدرت کے علاوہ ان مہربانوں کے سر تھا جو انتہائی خلوص اور مستقل مزاجی کے ساتھ دامے درمے، قدمے سخنے ان کو نقصان پہنچاتے رہے۔ دوسری وجہ جیسا کہ اوپر اشارہ کر چکا ہوں، یہ تھی کہ وہ اپنے خاص دوستوں سے اپنی حاجت اور ان کی حیثیت کے مطابق قرضہ لیتے رہے اور قرضے کو منافع سمجھ کر کھا گئے۔ بقول مرزا ان کا دل بڑا تھا اور قرض لینے میں انھوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ قرض پر لین دین ان کے مزاج میں اس حد تک رچ بس چکا تھا کہ مرزا کا خیال تھا کہ صبغے دراصل سہروردی حکومت کو زک پہنچانے کی غرض سے اپنی آمدنی نہیں بڑھاتے۔ اس لیے کہ آمدنی بڑھے گی تو لامحالہ انکم ٹیکس بھی بڑھے گا۔ اب تو ان کی یہ تمنّا ہے کہ بقیہ عمرِ عزیز "بنک اوور ڈرافٹ" پر گوشہ بدنامی میں گزار دیں لیکن اُن کی نیت بُری نہیں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ حالات نے ان کی نیک نیتی کو اُبھرنے نہ دیا۔ گزشتہ رمضان میں ملاقات ہوئی تو بہت اداس اور فکر مند پایا۔ بار بار پتلون کی جیب سے پرچہ نکال کر دیکھ رہے تھے۔ پوچھا، صبغے! کیا بات ہے؟ بولے کچھ نہیں۔ پروفیسر عبدالقدوس سے قرض لیے تیرہ سال ہونے کو آئے۔ آج یونہی بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اب واپسی کی سبیل کرنی چاہیے ورنہ وہ بھی دل میں سوچیں گے کہ شاید میں نادہند ہوں۔

جوانی میں خدا کے قائل نہیں تھے، مگر جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی، ایمان پختہ ہوتا گیا

یہاں تک کہ اب وہ اپنی تمام نالائقیوں کو سچے دل سے من جانب اللہ سمجھنے لگے تھے طبیعت ہی ایسی پائی تھی کہ جب تک چھوٹی سے چھوٹی بات پر بڑی سے بڑی قربانی نہ دے دیتے، انھیں چین نہیں پڑتا تھا۔ بقول مرزا، وہ انا الحق کہے بغیر سُولی پر چڑھنا چاہتے تھے۔ تجارت کو انھوں نے وسیلۂ معاش نہیں، حیلۂ جہاد سمجھا اور بہت جلد شہادت کا درجہ پایا۔

دُکان کی دیوار کا پلاسٹر ایک جگہ سے اکھڑ گیا تھا۔ اس مقام پر (جو تقریباً دو مربع گز تھا) انھوں نے ایک سرخ تختی، جس پر اُن کا فلسفۂ حیات بخطِ نستعلیق کندہ تھا، ٹانگ دی تھی:

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم

اس میں قطعی کوئی تعلّی نہیں تھی، بلکہ دیکھا جائے تو انھوں نے کسرِ نفسی ہی سے کام لیا کیونکہ باطل تو باطل، وہ حق سے بھی دبنے والے نہیں تھے! مرزا اکثر نصیحت کرتے کہ میاں! کامیابی چاہتے ہو تو کامیاب کتب فروشوں کی طرح بقدرِ ضرورت سچ بولو اور ہر کتاب کے حُسن و قبح پر خواہ مخواہ اپنی رائے ٹھونسنے کی بجائے گاہکوں کو انہی کی پسند کی کتابوں سے برباد ہونے دو۔ جو بیچارے تربوز سے بہل جاتے ہیں انھیں زبردستی انگور کیوں کھلاتے ہو؟ لیکن بنیے کا کہنا تھا کہ بیسویں صدی میں نجات انہی کی ہے، جن کے ایک ہاتھ میں دین ہے اور دُوسرے میں دُنیا۔ اور دائیں ہاتھ کو خبر نہیں کہ بائیں میں کیا ہے! تجارت اور نجابت میں سنجوگ ممکن نہیں۔ تجارت میں فوری ناکامی ان کے نزدیک مقیاس الشرافت تھی۔ انہی کا مقولہ ہے کہ اگر کوئی شخص تجارت میں بہت جلد ناکام نہ ہو سکے تو سمجھ لو کہ اس کے حسب نسب میں فی ہے۔ اس اعتبار سے انھوں نے قدم قدم پر، بلکہ ہر سودے میں اپنی نسبی شرافت کا وافر ثبوت دیا۔ حساس آدمی تھے۔ اس پر بدقسمتی یہ کہ ایک ناکام کتب فروش کی حیثیت سے انھیں

انسانوں کی فطرت کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اسی لیے بہت جلد انسانیت سے مایوس ہو گئے۔ انھوں نے تمام عمر تکلیفیں ہی تکلیفیں اُٹھائیں۔ شاید اسی وجہ سے اُنھیں یقین ہو چلا تھا کہ وہ حق پر ہیں۔ زندگی سے کب کے بیزار ہو چکے تھے اور ان کی باتوں سے ایسا لگتا تھا گویا اب محض اپنے قرض خواہوں کی تالیفِ قلوب کے لیے جی رہے ہیں۔ اب ہم ذیل میں وہ تاثرات و تعصبات مختصراً بیان کرتے ہیں جو اُن کی چالیس سالہ ناتجربہ کاری کا نچوڑ ہیں۔

دُکان کھولنے سے چار پانچ مہینے پہلے ایک ادبی خیر سگالی وفد (ادارہ برائے ترقیِ انجمن پسند مصنّفین) کے ساتھ سیلون ہو آئے تھے، جسے حاسد لنکا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس جزیرے کی سہ روزہ سیاحت کے بعد اُٹھتے بیٹھتے "ترقّی یافتہ ممالک" کی ادب نوازی و علم دوستی کے چرچے رہنے لگے۔ ایک دفعہ برادرانِ وطن کی ناقدری کا گلہ کرتے ہوئے فرمایا "آپ کے ہاں تو ابھی تک جہالت کی خرابیاں دور کرنے پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں مگر ترقّی یافتہ ممالک میں تو اب مارا مار ایسی کتابیں لکھی جا رہی ہیں جن کا مقصد ان خرابیوں کو دور کرنا ہے جو محض جہالت دور ہونے سے پیدا ہو گئی ہیں صاحب! وہاں علم کی ایسی قدر ہے کہ کتاب لکھنا، کتاب چھاپنا، کتاب بیچنا، کتاب خریدنا، حد یہ کہ کتاب چُرانا بھی ثواب میں داخل ہے۔ یقین مانیئے ترقّی یافتہ ممالک میں تو جاہل آدمی ٹھیک سے جُرم بھی نہیں کر سکتا"۔ شامتِ اعمال، میرے مُنہ سے نکل گیا، "یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ترقّی یافتہ ممالک میں کوئی کتاب اُس وقت تک اچھی خیال نہیں کی جاتی، جب تک کہ اس کی فلم نہ بن جائے اور فلم بننے کے بعد کتاب پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔ انھیں غصّہ آ گیا "تین پیسے کی چھوکری" کا کونا موڑ کر واپس الماری میں رکھی اور میرے لب و لہجے کی ہُو بہُو نقل اُتارتے ہُوئے بولے "اور آپ کے ہاں یہ کیفیت ہے کہ نوجوان اس وقت تک اردو کی کوئی کتاب پڑھنے کی حاجت محسوس

نہیں کرتے، جب تک پولیس اسے فحش قرار نہ دے دے اور فحش قرار پانے کے بعد اس کے بیچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"۔ ان کے طنز میں طعنے کا رنگ آچلا تھا، اس لیے میں نے جھٹ سے حامی بھر لی کہ پولیس اگر دل سے چاہے تو تمام اچھی اچھی کتابوں کو فحش قرار دے کر نوجوانوں میں اُردو ادب سے گہری دلچسپی پیدا کر سکتی ہے۔

میرے لہجے کا نوٹس نہ لیتے ہوئے اُلٹے مجھی سے اُلجھنے لگے کہ آپ بات کی تہ تک نہیں پہنچے۔ آپ دھڑا دھڑ کتابیں چھاپ سکتے ہیں، مگر زبردستی پڑھوا نہیں سکتے۔ میں نے کہا، کیوں نہیں؟ اٹھا کے نصاب میں داخل کر دیجیے۔ وہ بھلا ہار ماننے والے تھے۔ کہنے لگے، اگر ایک پوری کی پوری نسل کو ہمیشہ کے لیے کسی اچھی کتاب سے بیزار کرنا ہو تو سیدھی ترکیب یہ ہے کہ اسے نصاب میں داخل کر دیجیے۔

کتب فروشی کی بدولت صبغے کا سابقہ ایسے ایسے پڑھنے اور نہ پڑھنے والوں سے پڑا

ہزاروں سال نرگس جن کی بے نوری پہ روتی ہے

ان میں خیام کے وہ دل دادہ بھی شامل تھے جو اصل رباعیوں میں ترجمے کی خوبیاں تلاش کرتے پھرتے تھے۔ ان میں وہ سال خوردہ کتاب خواں بھی تھے جو کجلائے ہوئے کوئلوں کو دہکانے کے لیے بقول مرزا عُریاں ناولوں سے منہ کالا کرتے اور سمجھتے کہ ہم اردو کی عزت بڑھا رہے ہیں۔ (یہ قول انھی کا ہے کہ فحش کتاب میں دیمک نہیں لگ سکتی کیونکہ دیمک ایسا کاغذ کھا کر افزائش نسل کے قابل نہیں رہتی۔) ان میں وہ خوش نصیب بھی تھے، جن کے لیے کتاب بہترین رفیق ہے اور وہ کم نصیب بھی جن کے لیے واحد رفیق!

اور اس بے نام قبیلے میں وہ جدت پسند پڑھنے والے بھی شامل تھے جو ہر لحظہ

"تازہ بہ تازہ، نو بہ نو کے طلب گار رہتے۔ حالانکہ ان جیسوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ فقط ڈکشنری ہی ایک ایسی کتاب ہے، جسے وہ جب بھی دیکھیں، انشاء اللہ نئی معلوم ہوگی۔ لیکن ایک حد تک صبغے کی بھی زیادتی تھی کہ نئی اردو کتابوں کو اپنے دل اور دکان میں جگہ دینا تو بڑی بات ہے، چمٹے سے پکڑ کر بھی بیچنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایک دن خاقانیِ ہند استاد ذوق کے قصائد کی گرد ہفتہ وار ٹائم سے جھاڑتے ہوئے کٹکٹا کر کہنے لگے کہ آج کل لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ادب ایک "کیپ سول" میں بند کر کے ان کے حوالے کر دیا جائے، جسے وہ کوکا کولا کے گھونٹ کے ساتھ غٹک سے حلق سے اتار لیں۔ انسانی تہذیب پتھر اور بھوج پتر کے عہد سے گزر کر اب ریڈرز ڈائجسٹ کے دور تک آ گئی ہے۔ سمجھے؟ یہ مصنّفوں کا دور نہیں، صحافیوں کا دور ہے! صحافیوں کا!

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "مگر صحافت میں کیا قباحت ہے؟"

بولے "کچھ نہیں۔ بڑا مصنّف اپنی آواز پبلک تک پہنچاتا ہے، مگر بڑا صحافی پبلک کی آواز پبلک تک پہنچاتا ہے!"

مصنّفوں کا ذکر چھڑ گیا تو ایک واردات اور سنتے چلیے۔ سات آٹھ مہینے تک وہ اردو افسانوں کا ایک مجموعہ بیچتے رہے، جس کے سرورق پر مصنّف کے دستخط بقلم خود ثبت تھے اور اوپر یہ عبارت: "جس کتاب پر مصنّف کے دستخط نہ ہوں وہ جعلی تصوّر کی جائے۔"

ایک روز انھیں رجسٹری سے مصنّف کے وکیل کی معرفت نوٹس ملا کہ ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ آپ ہمارے مؤکّل کی کتاب کا ایک مصدّقہ ایڈیشن عرصہ آٹھ ماہ سے مبیّنہ طور پر فروخت کر رہے ہیں، جس پر مصنّف مذکور کے دستخط بقید تاریخ ثبت ہیں۔ آپ کو بذریعہ نوٹس ہٰذا مطلع و متنبہ کیا جاتا ہے کہ محوّلہ بالا کتاب اور دستخط دونوں سراسر جعلی ہیں

اصل ایڈیشن میں مصنّف کے دستخط سرے سے ہیں ہی نہیں۔ اس واقعے سے انھوں نے ایسی عبرت پکڑی کہ آئندہ کوئی ایسی کتاب دکان میں نہیں رکھی، جس پر کسی کے بھی دستخط ہوں۔ بلکہ جہاں تک بن پڑتا، انہی کتابوں کو ترجیح دیتے، جن پر مصنّف کا نام تک درج نہیں ہوتا۔ مثلاً الف لیلیٰ، ضابطۂ فوجداری، ریلوے ٹائم ٹیبل، انجیل۔

تباہی کی جو طبعزاد راہ بلکہ شاہراہ انھوں نے اپنے لیے نکالی، اس پر وہ تو کیا، قارون بھی زیادہ دیر گامزن نہیں رہ سکتا تھا، کیونکہ منزل بہت دور نہیں تھی۔ آخر وہ دن آہی گیا، جس کا دشمنوں کو انتظار تھا اور دوستوں کو اندیشہ۔ دکان بند ہو گئی۔ خزانچی جی کی تنخواہ ڈھائی مہینے سے چڑھی ہوئی تھی۔ لہٰذا خالی الماریاں، ایک عدد گول چوبی جو نادہندوں کی فہرستوں سے منہ تک بھری تھی۔ چاندی کا خوبصورت سگرٹ کیس، جسے کھولتے ہی محسوس ہوتا تھا گویا بیڑی کا بنڈل کھل گیا۔ نسیینی، جس کی صرف اوپر کی تین سیڑھیاں باقی رہ گئی تھیں، خواب آور گولیوں کی شیشی، کراچی ریس میں دوڑنے والے گھوڑوں کے شجرہ ہائے نسب، نومبر سے دسمبر تک کا مکمل کیلنڈر کیل سمیت۔ یہ سب خزانچی جی نے صیغے کی اوّلین غفلت میں ہتھیا لیے اور راتوں رات اپنی تنخواہ کی ایک ایک پائی گدھا گاڑی میں ڈھو ڈھو کر لے گئے۔ دوسرے دن دکان کا مالک بقایا کرائے کی مد میں جو جائداد منقولہ و غیر منقولہ اٹھا کر یا اُکھاڑ کر لے گیا، اس کی تفصیل کی یہاں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ ہمارے پڑھنے والوں کو بس اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ ان میں سب سے قیمتی چیز بغیر چابی کے بند ہونے والا ایک قفل فولادی ساختۂ جرمنی تھا۔ پرانا ضرور تھا، مگر ایک خوبی اس میں ایسی پیدا ہو گئی تھی جو ہم نے تو کیا، سننے جرمن تالوں میں بھی نہیں دیکھی، یعنی بغیر چابی کے بند ہونا اور اسی طرح کھلنا!

صبغے غریب کے حصے میں صرف اپنے نام (مع فرضی فرزندان) کا سائن بورڈ آیا۔ جس کو سات روپے مزدوری دے کر گھر اٹھوا لائے اور دوسرے دن سوا روپے میں محلے کے کباڑی کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور دو مہینے تک اپنی ہتھیلی کا شبانہ روز مطالعہ کرنے کے بعد ایک ٹریننگ کالج میں اسکول ماسٹروں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ مرزا کے الفاظ میں صبغے کی کتب فروشانہ زندگی کے باب کا انجام نہایت افسانوی رہا۔ جس افسانے کی طرف یہاں مرزا کا اشارہ ہے، وہ دراصل کائی لنگ سکی کی ایک مشہور چینی کہانی ہے، جس کا ہیرو ایک آرٹسٹ ہے۔ ایک دن وہ اپنی ایک ماڈل لڑکی کی خوبصورتی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسی وقت اپنے سارے برش اور کینوس سمیٹ سماٹ کر جلا ڈالے اور ایک سرکس میں ہاتھیوں کو سدھانے کا کام کرنے لگا۔

جنوری ۱۹۶۲ء

سیزر، ماتاہری اور مرزا

"ہائے اللہ! یہ ہاتھی کا ہاتھی کتّا کاہے کو لے آئے؟"

"چوکیداری کے لیے۔"

"کس کی؟"

"گھر کی"

"اِس گھر کی؟"

"ہاں! بہت ہی ہوشیار کتّا ہے۔ گھر میں کچھ نہ ہو، تب بھی چوکیداری کرسکتا ہے۔"

اِس ازدواجی مکالمے سے بعد میں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ تنخواہ ملتے ہی ہم نے گھر گرہستی کا ضروری سامان خرید ڈالا تاکہ کتّا اس کی چوکیداری کر سکے، لیکن والدین کی سمجھ میں آنے والا جو فوری فائدہ ہم نے سرِدست بیان کیا، اس سے اپنے معصوم بچّوں کو جان بوجھ کر محروم رکھنے کے لیے پتّھر کا کلیجہ چاہیے۔ وہ فائدہ یہ تھا کہ آخر کو یہ ایک انگریز کا کتّا تھا، اور یہ کون نہیں جانتا کہ ہمارے ہاں اَن پڑھ سے اَن پڑھ آدمی بھی اپنے کتّے کا نام انگریزی رکھتا ہے اور انگریزی ہی میں اُس سے بات چیت اور ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اشارۃً توجّہ دلائی کہ اس کی وجہ سے بچّوں کو انگریزی بولنا آجائے گی۔

یہ سنتے ہی بیگم نے کتّے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور زنجیر ایسے فیصلہ کن جھٹکے کے ساتھ ہمارے ہاتھ سے چھین لی، جیسے لیڈی میکبتھ نے میکبتھ کے ہاتھ سے خنجر چھینا تھا:

INFIRM OF PURPOSE!
GIVE ME THE DAGGER...

یادش بخیر! اس ڈراپ سین سے کوئی بیس سال اُدھر جب آتشؔ جوان بلکہ نوجوان تھا، اُس نے نیلی آنکھوں، بھری بھری ٹانگوں اور ''بلونڈ'' بالوں والی میم کو باغ میں اپنے جیبی سائز کے ''پومرینین'' کُتّے کو بھینچ بھینچ کر پیار کرتے دیکھا تھا۔ تھا بھی ظالم اسی قابل۔ گول مٹول۔ جھبرا۔ سفید گالا سے بالوں سے سارا جسم اس بری طرح ڈھکا ہُوا تھا کہ جب تک چلنا شرُوع نہ کرے، یہ بتانا مشکل تھا کہ منہ کس طرف ہے۔ ہائے! وُہ بھی کیا زمانہ تھا جب ہر چیز جوان تھی۔ ہر چیز حسین تھی۔ ہر چیز پہ ٹوٹ کے پیار آتا تھا۔ کیسے مہکتے دہکتے دن تھے وہ بھی۔

مری سانس میں ہے گرمی کہ یہ لُو سی چل رہی ہے

اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن ان گنہ گار آنکھوں کو زنجیر کے دونوں سروں پر حسن نظر آیا اور دل میں یہ پیار بھری حسرت کروٹیں لینے لگی کہ انگریز کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد کبھی فراغت اور گوشۂ چمن نصیب ہُوا تو ایک نیلی آنکھوں، بھری بھری ٹانگوں اور ''بلونڈ'' بالوں والا کُتّا ضرور پالیں گے۔ مگر ایک تو بقولِ مرزا اعلیٰ نسل کے کُتّے باوا کے مول ملتے ہیں۔ دُوسرے اُس زمانے میں مکان اتنا تنگ تھا کہ جانور کا تندرُست رہنا مُحال۔ وُہ تو خُدا بھلا کرے مسٹر ایس۔ کے ڈین (شیخ خیرالدّین) ایم۔ اے (آکسن) کا، جو ہماری آتشِ شوق کو ہوا دیتے رہے۔ یہ ہمارے دُور پرے کے عزیز ہمسائے تھے۔ ان کے پاس

ایک بڑا جیّد کُتّا تھا۔ خالص ''گرے ہاؤنڈ''، جسے وہ پڑوسیوں کا خُون پلا پلا کر پال رہے تھے۔ دہنِ رسا رکھتا تھا۔ جسم تیتیے جیسا اور مزاج بھی ایضاً۔ یُوں تو بھونکنے کے تمام متداول اصناف میں اُستادانہ مہارت رکھتا تھا، لیکن چاندنی چھٹکی ہو اور طبیعت حاضر، تو پھر کچھ ایسی ''اُوریجنل'' طرز اختیار کرتا کہ جتنی مرتبہ بھونکتا، طبیعت کو ہر بار ایک نئی کوفت حاصل ہوتی۔ دیکھا گیا ہے کہ ایسے ویسے شوقیہ بھونکنے والے کُتّوں کا سانس تو دو چار دفعہ ہی ٹیاؤں ٹیاؤں کرنے میں اُکھڑ جاتا ہے۔ مگر یہ کُتّا بقول مرزا، اردو میں بھونکتا تھا، یعنی بھونکتا ہی چلا جاتا تھا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ مسٹر ایس۔ کے ڈین اپنے بِنج کے بزرگوں کو اپنے لائق نہیں سمجھتے۔ مگر اپنے اصیل کُتّے کا شجرۂ نسب پندرھویں پُشت تک فرفر سُناتے اور اس کے آبا و اجداد پر اِس طرح فخر کرتے، گویا ان کا خالص خُون اُن کی ناچیز رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ کہتے تھے، نہرِ سویز کے اِس طرف اِتنا خالص و خُونخوار کُتّا ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ اس کا دادا ''اینڈرہ'' جُون ۱۹۴۱ء کو پانڈیچری میں، دیسی کُتّوں سے لڑتا ہُوا مارا گیا۔ چاندنی رات۔ ہُوہُو کا عالَم۔ چور لاپے پر گھمسان کا رَن پڑا۔ کُتّوں کے پُشتے لگ گئے تھے۔ محلّے میں مشہور تھا کہ مسٹر ڈین کے ہاں کوئی گھبرایا گھبرایا فائر بریگیڈ کو فون کرنے بھی چلا جائے تو اُسے اپنے مرحُوم کُتّوں کے البم دِکھائے بغیر فون کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ ڈرائنگ رُوم میں مسٹر ڈین کی ایک بڑی سی تصویر بھی ٹنگی تھی، جو انھوں نے اپنے کُتّے کے جیتے ہُوئے کپ اور ٹرافیوں کے ساتھ کھڑے ہو کر اور اس کے تمغے کوٹ پر لگا کر کھنچوائی تھی۔ ہماری دیرینہ حسرت و شیفتگی کے پیشِ نظر ایک دِن تخلیے میں ہمیں اپنے ٹیپ ریکارڈر پر موجُودہ کُتّے کے والدِ مرحُوم کا بھونکنا سُنایا۔ سُن کر خُود آبدیدہ ہُوئے اور ہمیں بھی اُن کی حالت دیکھ کر رونا آ گیا۔

کُتّا پالنے کی حسرت کا اِظہار ہم نے بارہا مرزا کے سامنے کیا، مگر وہ کُتّے کا نام آتے

ہی کلٹنے کو دوڑتے ہیں۔ کہتے ہیں "ہٹاؤ بھی! واہیات جانور ہے۔ بالکل بے مصرف۔ کُتّے کی تخلیق کا واحد مقصد یہ تھا کہ پطرس اس پر ایک لاجواب مضمون لکھے۔ سو یہ مقصد عرصہ ہوا، پورا ہو چکا اور اب اس نسل کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں"۔ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ نسل ناپید ہو بھی گئی تو اردو طنز نگاروں سے نام چلتا رہے گا۔ یوں تو سبھی جانوروں کے بارے میں مرزا کی معلومات ظالمانہ حد تک ادھوری ہیں (مثلاً ابھی کل شام تک وہ لومڑی کو گیدڑ کی مادہ سمجھے بیٹھے تھے اور ——— غضب خدا کا ——— بڑے چیونٹے کو عام چیونٹی کا نر!) مگر کتوں کے ساتھ وہ خصوصیت سے تعصب برتتے ہیں اور اپنی بات کی پچ میں ایک سے ایک دلیل پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک دن کہنے لگے:

"جس گھر میں کتا ہو اس گھر میں چور ہی نہیں، رحمت کے فرشتے بھی داخل نہیں ہو سکتے"۔

"چور کا داخل نہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر رحمت کے فرشتوں کو کیا ڈر ہے؟"

"اس لیے کہ کتا ناپاک ہوتا ہے"۔

"مگر کتے کو صاف ستھرا بھی تو رکھا جا سکتا ہے۔ انگریزوں کو دیکھیے، صبح و شام نہلاتے ہیں"۔

"اُپلے کو اگر صبح و شام صابن سے دھویا جائے تو کیا پاک ہو جائے گا؟"

"مگر سوال یہ ہے کہ کتا ناپاک کیسے ہوا؟"

"کج بحثی کوئی تم سے سیکھے۔ اللہ بخشے نانی جان کہا کرتی تھیں کہ کتے کے منہ میں سؤر کی رال ہوتی ہے"۔

"لیجیے۔ آپ نے ناپاکی کی ایک اچھوتی توجیہہ تلاش کر لی"۔

"بھائی میرے! ایک موٹی سی پہچان آج تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ یاد رکھو، ہر

وُہ جانور جسے مُسلمان کھا سکتے ہیں، پاک ہے"۔

"اِس لحاظ سے مُسلمان ممالک میں بکروں کو اپنی پاکی و طہارت کے سبب، خاصا نقصان پہنچا ہے"۔

"بکنے والے بکا کریں۔ مُسلمانوں نے کُتّے کو ہمیشہ کُتّا ہی کہا۔ بڑے آدمیوں کے نام سے نہیں پکارا"۔

"بڑے آدمیوں کی ایک ہی رہی۔ آپ نے سُنا نہیں کہ نسلاً سب کُتّے ایک زمانے میں بھیڑیے تھے؟ آدمی کی صحبت میں ان کا بھیڑیا پن جاتا رہا۔ مگر خود آدمی۔۔۔"

"دیکھو، تم پھر لٹریچر بولنے لگے۔ علموں بس کریں او یار!"

اِس بارۂ خاص میں مرزا کے نسلی تعصّب کی جڑیں ان کے سگ گزیدہ بچپن تک پہنچتی ہیں۔ اِس لیے ہم نے خواہ مخواہ ان سے اُلجھنا مناسب نہ سمجھا اور چُپ چاپ کُتّا رکھنے کی آرزو کو پالتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ دن آگیا، جب ہمارا انگریز افسر بھاری دل اور اس سے زیادہ بھاری قدموں کے ساتھ اپنے وطن کی جانب روانہ ہُوا۔ اور روانگی سے قبل اس تعلقِ خاطر کی بنا پر جو ہم کو اُس سے اور اُس کو اپنے کُتّے سے تھا، دریافت کیا:

"تم چاہو، تو میرا کُتّا بطور یادگار رکھ سکتے ہو۔ امپورٹڈ★ السیشن ہے۔ تیرہ ماہ کا۔ سیزر کہہ کر پکارو تو دُم ہلاتا آتا ہے"۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے: اِس صلائے خاص میں ایک کمزور دل کے آدمی کے لیے للچاہٹ کے کیا کیا سامان پوشیدہ تھے۔ اِس میں مطلق شبہ نہ تھا کہ اس سے بہتر کوئی یادگار نہیں ہو سکتی کہ جب بھی وُہ بھونکے گا، افسر کی یاد تازہ ہو جائے گی۔ پھر یہ کہ السیشن! کبھی ہم اس کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں! افسر کی ادنیٰ مہربانی سے ہمیں

★ امپورٹڈ ——— درآمد شدہ

اتنی خوشی ہوتی ہے کہ بقول مرزا اگر اس وقت ہمارے دم ہوتی تو ایسی ہلتی کہ پھر نہ تھمتی۔ رہی سہی ہچکچاہٹ کو لفظ "امپورٹڈ" نے دُور کر دیا۔ اُس زمانے میں ہر وہ شے جو وطنِ عزیز میں پیدا نہ ہوتی ہو، قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ چنانچہ ہر بگڑا ہُوا مسلمان رئیس یہ ثابت کرنے پر تُلا بیٹھا تھا کہ نہ صرف اس کے کُتے کے، بلکہ اُس کے اپنے بزرگ بھی اصلی امپورٹڈ تھے اور خالی ایک تلوار لے کر ماوراءالنّہر سے ہندوستان میں وارد ہُوئے تھے۔ امپورٹڈ کُتا سماج میں کیا حیثیت رکھتا ہے، اس کا سرسری سا اندازہ اِن واقعات سے لگایا جا سکتا ہے جو دو سال پیشتر ہماری نظر سے گزر چکے تھے۔ ہم سے چار گھر دُور مسٹر خلجی بیرسٹر رہتے تھے۔ ان کے والدِ مرحوم نے چند نایاب کُتے ترکے میں چھوڑے تھے (چھوڑنے کو تو چند نایاب کتابیں بھی چھوڑی تھیں، مگر چونکہ وہ بھی کُتوں ہی سے متعلق تھیں، اس لیے ہم نے قصداً ذکر نہیں کیا) انہی میں کی ایک دوغلی سی کُتیا تھی۔ (جس کے متعلق اِن کا فخریہ دعویٰ تھا کہ اس کی نانی جوزیفین کے تعلقات راسپوٹن سے رہ چکے تھے، جو ایک امپورٹڈ "گریٹ ڈین" کُتا تھا۔ نیز یہ کہ وہ شملہ سول اینڈ ملٹری کینل★ سے اس وارداتِ کلبی کا سرٹیفکیٹ حاصل کر چکے ہیں، جو اُن کے سونے کے کمرے میں آج بھی آنکھوں کو نُور، دل کو سُرور بخشتا ہے۔) نام ماتاہری رکھ چھوڑا تھا۔ کسی زمانے میں اس کے لجلجے کان ہر وقت لٹکے رہتے تھے۔ مگر اُنھوں نے شہر کے بہترین سرجن سے آپریشن کرا کے السیشن کی طرح کھڑے کرا لیے تھے۔ رنگ ہلکا براؤن جیسے بھٹی آنچ پر سنکا ہُوا توس۔ بیرسٹر صاحب کی اینگلو انڈین بیوی (جو خود بھی بڑی بھری پُری عورت تھی اور سلطنت کی طرح دست بدست آئی تھی) اس پر اپنے ہاتھ سے یُوڈی کلون چھڑک کر، مگرمچھ کی کھال

★ KENNEL دارالکلاب

کا جڑاؤ کالر پہنائے گھمانے لے جاتی اور اپنے جوتے سے میچ کرنے کے لیے اس پر ٹوتھ برش سے خضاب لگا دیتی۔ کبھی سیاہ، کبھی بولتا ہوا عنابی۔ یہ تو گرمیوں کی شاموں کے معمولات میں سے تھا۔ جاڑے میں ماتا ہری فرنچ برانڈی کے دو چمچے غٹاغٹ پی کر ایرانی قالین پر اپنی مالکہ کی طرح اطالوی ریشم کی انگیا کی تہمت لگاتے سوتے جاگتے پہرا دیتی تھی۔ صورتاً بھیڑیا اور سیرۃً بھیڑ۔ ہم بھیڑ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ صبح و شام ولایتی بسکٹ اور ڈبّے کا گوشت کھاتے رہنے کے باوجود (یا شاید اسی وجہ سے) بقر عید کی رات کو محلّے کے قصائی کے ساتھ بھاگ گئی اور تین شب بعد مٹکتی مٹکاتی لوٹی بھی تو اس طنطنے سے کہ ایک درجن رُفقائے حیات جلو میں۔ چال جیسے قرۃ العین حیدر کی کہانی ——— پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتی ہوئی۔ خوش صحبتی کے گلی گلی چرچے، مگر ذہانت چھو کر نہیں گئی تھی۔ بقول مرزا بالکل گدھی تھی۔ انھی سے مروی ہے کہ اکثر بازاری کُتیوں کے پلّے آکر چپر چپر اس کے دودھ کا آخری قطرہ تک پی جاتے اور اپنے بچّے دُم ہلاتے یا پلاسٹک کی ہڈّیاں چچوڑتے رہ جاتے۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے چوکیداری کے لیے چنداں بُری نہ تھی کہ اپنی عزّت آبرو کے علاوہ ہر چیز کی بخوبی حفاظت کر سکتی تھی۔ اس کے یہ لچھّن دیکھے تو بیرسٹر صاحب نے اُس کی رکھوالی کے لیے ایک چوکیدار رکھّا۔ اسی سال گرمیوں کی چھٹّیوں میں وہ اپنے کُنبے اور کُتیا سمیت کار سے مَری جانے لگے تو ان کے نانا جان قبلہ نے اچھّا خاصا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ بس اَڑ گئے کہ میں اس "نجس کُتّی" کے ساتھ کار میں سفر نہیں کر سکتا۔ لہٰذا بیرسٹر صاحب ان کو ہمارے ہاں چھوڑ گئے۔ جتنے دن بزرگوار موصوف ہمارے ہاں مہمان رہے بعد نمازِ عشاء ہاتھ پھیلا پھیلا کر منتقمِ حقیقی سے دعا مانگتے کہ پروردگارا! مال زادی ماتا ہری سالانہ زچگی میں اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے۔ کُتیا کہیں کی! ہر رنگ، ہر سائز کی گالی ان کی روزمرّہ

گفتگو میں نگینے کی طرح جڑی ہوتی۔ دِن بھر نماز کی چوکی پر بیٹھے سب کو حسبِ مراتب خورد و کلاں گالیاں دیتے رہتے۔ دُعا میں بھی بے ساختہ یہی رنگ رہتا۔ مرزا کا خیال تھا کہ اگر وہ اپنے دل پر جبر کر کے دُعا میں سے گالیاں حذف کر دیتے تو ساری تاثیر جاتی رہتی۔ جو دُعا دل سے نہ نکلے کیونکر مستجاب ہو سکتی ہے؟ اوقاتِ دُعا کے علاوہ ہر آئے گئے کے سامنے اپنے نافرمان نواسے کے امتیازی سلوک کی شکایتوں کے دفتر کھول دیتے۔ ان کے تمام شکوے شکایتوں کا لبِ لباب بس یہ تھا کہ میرے ساتھ کُتّے جیسا سلوک کیوں نہیں کیا جاتا! آخر میں بھی جان دار ہوں۔

امپورٹڈ کُتّے کی چھبیل چھبیلی نواسی کی یہ لذیذ حکایت بیان کرنے کا مدعا یہ ہے کہ لفظ "امپورٹڈ" نے انگریز افسر کے منہ سے نکلتے ہی ہماری مدافعت کی دیوار کو، جو کبھی بھی بہت بلند اور پختہ نہ تھی، یک لخت ڈھا دیا۔ بھلا ایسے صحبت یافتہ کُتّے روز روز کہاں ملتے ہیں۔ بالآخر شوقِ فضول ہمارے فطری خوف پر غالب آیا اور جہاز کا لنگر اُٹھنے سے پہلے ہم نے اپنے آپ کو ایک خوش نصیب کُتّے کا مالک پایا۔

لیکن ایک بات کے لیے ہم بھی ذہنی بلکہ جسمانی طور پر تیار نہ تھے۔ "تیرہ ماہ" کی عُمر سُن کر ہمارے تصوّر میں ایک بہت ہی بھولی بھالی صُورت اُبھری تھی۔ ہم نے سوچا، جیسے تیرہ مہینے کا آدمی کا بچّہ بڑا پیارا سا ہوتا ہے۔ بھَس مُتھنا، گبدا سا، غاؤں غاؤں کرتا ہُوا۔ ویسا ہی یہ بھی ہو گا۔ سچ تو یہ ہے کہ بچّہ کسی کا بھی ہو، بڑا "سوِیٹ" لگتا ہے۔ پھر یہ تو اسٹیشن کا بچّہ ٹھیرا۔ جی ہاں بچّہ! دراصل ہم اس کے "امپورٹڈ" ہونے سے اِس قدر مرعُوب تھے کہ پِلّا کہتے ہُوئے خود شرم سی محسُوس ہوتی تھی۔

مگر سیزر ہر اعتبار سے ہماری توقّعات سے بڑھ کر نکلا۔ اس کا سراپا کھینچ کر ہم

ناظرین کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے ڈیل ڈول کا سرسری سا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے دیرینہ کرم فرما پروفیسر قاضی عبدالقدوس کی سالم ران اُس کے منہ میں آجاتی تھی۔

اور یہ پروفیسر مذکور ہی نے بتایا کہ بندۂ خدا! تم نے بھی بڑا غضب کیا! تیرہ مہینے کا السیشن تو پُورا پاٹھا کتّا ہوتا ہے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ تین مہینے سے زیادہ کا السیشن نہیں لینا چاہیے۔ اس پر مرزا نے یہ نمک چھڑکا کہ آنکھوں دیکھی بات ہے، کُتّے کی تندرستی اور نسل اگر مالک سے بہتر ہو تو وہ آنکھیں ملا کر ڈانٹ بھی نہیں سکتا۔ پھر یہ تو غیر معمولی طور پر خونخوار بھی نظر آتا ہے۔ ہم نے کہا، مرزا! تم خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔ بولے جو شخص کُتّے سے بھی نہ ڈرے، مجھے اس کی ولدیّت میں شبہ ہے۔ ہم نے کہا مرزا! کُتّا اگر خونخوار نہ ہو تو پالنے سے فائدہ؟ پھر آدمی بکری کیوں نہ پال لے۔ بولے، ہاں! بکری کُتّے سے بدرجہا بہتر ہے۔ بڑی بات یہ کہ جب چاہو، کاٹ کر کھا جاؤ۔

گرچہ چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو بھاتی ہے بات بکری کی

بحثا بحثی میں ہم دونوں پٹری سے اُتر گئے تھے۔ لہٰذا پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے بحیثیّت ثالث بالخیر بیچ میں پڑ کے اس معتدل رائے پر بحث ختم کی کہ کُتّے میں سے اگر جبڑا نکال دیا جائے تو خاصا معقول اور مخلص جانور ہے۔

قاضی عبدالقدوس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا کہ بڑا کُتّا بڑی مشکل سے سدھایا جاتا ہے۔ پھر نیا گھر، نئے چہرے، نئی بُو باس۔ نتیجہ یہ کہ پہلی رات خود سویا نہ دُوسروں کو سونے دیا۔ رات بھر ایک سانس میں منہ زبانی بھونکتا رہا۔ دُوسری رات بھی وحشت کا یہی عالم رہا۔

البتہ چوبیس گھنٹے کی تربیت سے اتنا فرق ضرور پڑا کہ فجر کے وقت جن اراکینِ خاندان کی آنکھ لگ گئی تھی، ان کے منہ چاٹ چاٹ کر خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ تیسرے رتجگے سے پہلے ہم نے اُسے ایک سونے کی گولی دی۔ کوئی افاقہ نہیں ہُوا۔ چوتھی رات دو دیں، مگر صاحب! کیا مجال، جو ذرا جھپکا ہو جائے۔ زچ ہو کر مرزا سے رجوع کیا تو کہنے لگے "میری مانو، آج اسے کچھ نہ دو۔ خود تین گولیاں کھا لو۔" ہم نے ایسا ہی کیا۔ اس رات وہ بالکل نہیں بھونکا!

لیکن حیرت اس بات پر ہُوئی کہ صُبح دس بجے ہمارے بہرے ہمسائے خواجہ شمس الدّین (امپورٹر اینڈ ایکسپورٹر) نے، جو نئے نئے پڑوس میں آئے تھے، ہمیں بڑی بدتمیزی سے جھنجھوڑ کر جگایا اور شکایت کی کہ رات بھی آپ کا کُتّا میرے گھر کی طرف منہ کر کے خُوب بھونکا۔ اور (ہیرنگ ایڈ یعنی سُننے کا آلہ اپنے کان میں فٹ کرتے ہُوئے) اور دیکھ لیجیے، اس وقت بھی بہت جی لگا کے بھونک رہا ہے! ہم نے کہا، آپ کا ریڈیو بھی تو سارے سارے دِن محلّے کو سر پر اُٹھائے رکھتا ہے۔ خدا گواہ ہے جس دن سے آپ پڑوس میں اُٹھ کر آئے ہیں، ہم نے اپنے ریڈیو پر پروگرام سُننا بند کر دیا ہے۔ پھر یہ کہ ہمارے پاس تو کُتّے کا لائسنس بھی ہے۔ لائسنس کا نام آتے ہی اُن کے چہرے کا رنگ سیاہ سے بینگنی ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں وہ اور ان کا ریڈیو تین ہفتے تک خاموش رہے۔ البتّہ ان کے چوکیدار کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کے اپنی ہیرنگ ایڈ کان سے لگا کر سنتے ہیں کہ ہمارا کُتّا بھونک رہا ہے یا سو گیا۔ ہمارے کانوں میں یہ بھنک بھی پڑی کہ اب وہ ہر ایک سے یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ بعض نادہند اپنے قرض خواہوں سے بچنے کے لیے کُتّے پال لیتے ہیں۔ وہ یہ کہتے بھی سُنے گئے کہ شرفا کے گھر کُتّا ہو تو بُرا نہیں، لیکن رذیلوں کا کُتّا شریفوں کا کُتّا معلوم نہیں ہوتا۔ ادھر ان کی بیوی کی بدگمانی کا یہ حال تھا کہ سیٹر رجھوٹوں بھی دروازے میں سے جھانک لے تو جھٹ ہاتھ بھر کا گھونگھٹ نکال لیتی

تھیں۔

تین ہفتے بعد دیکھا کہ پھر منہ پھلائے کلبۂ احزاں کی طرف چلے آرہے ہیں۔ ہمارے پرجوش السلام علیکم کے جواب میں فرمایا "دیکھیے، اس سور کے بچے نے کیا کیا ہے؟" مرزا بیچ میں بول اٹھے۔ "منہ سنبھال کر بات کیجیے۔ وہ کتے کا بچہ ہے۔" اس جملۂ معترضہ کے بعد ہم بھی کچھ سخت بات کہنے والے تھے کہ مرزا نے جو اس وقت ہم سے "لوڈو" کھیل رہے تھے، ہمارے کہنی مار کر اپنی چھجے دار بھووں کی جنبش سے خواجہ شمس الدین کی بائیں ٹانگ کی طرف اشارہ کیا جو گھٹنے تک پائنچے سے بے نیاز تھی۔ ہم نے کن انکھیوں سے دیکھا تو زخم واقعی اتنا لمبا تھا کہ زپ لگا کر بآسانی بند کیا جا سکتا تھا۔

"ندامت اور انسانی ہمدردی کے جذبات سے مغلوب ہو کر ہم نے پوچھا:

"کیا کتے نے کاٹا ہے؟"

"جی نہیں! میں نے خود ہی کاٹا ہے!"

"ارے صاحب! گھوڑے بھی کچھ کم ظالم نہیں ہوتے؟" مرزا پھر بول اٹھے۔

مرزا کا یہ پُرشماتت وار ایسا اچانک اور کاری تھا کہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ایک دفعہ کو اپنے جسمانی زخم بھول گئے اور اندرونی چوٹوں کو سہلاتے اور گھوڑوں کی ماں بہنوں کو ارمان بھری گالیاں دیتے "فیڈ آؤٹ" ہو گئے۔ قصّہ دراصل یہ تھا کہ ان کے بزرگ خیبر پار سے گھوڑے بیچنے ہندوستان آئے تھے اور مالا مال ہو کر یہیں پڑ رہے۔ آگے چل کر ان بزرگوں کی اولاد کو انہی گھوڑوں کی ناخلف اولاد نے تباہ کر ڈالا۔ وہ اس طرح کہ اس خانوادے کے آخری چشم و چراغ خواجہ شمس الدین کی "بلیک" کی کمائی کی ایک ایک پائی ریس میں انہی گھوڑوں کے بھینٹ چڑھتی اور ان کے اپنے اہلِ و عیال انکم ٹیکس والوں کی طرح منہ دیکھتے رہ جاتے۔

اس نوع کی خوش طبعی سے قطعِ نظر سیزر ابتدائے سِن بدتمیزی سے پہلے درجے کا کاہل واقع ہُوا تھا اور دوڑ دوڑ کر کام کرنے کے بجائے دن کے بیشتر حصّے میں دروازے پر محراب کی شکل میں چھائی ہُوئی بوگن ولیا* کے سائے میں لوٹیں لگاتا رہتا۔ درزی کی سُوئی یوں تو ہر طرح کے کپڑے میں سے نکلتی ہے، مگر ایمان کی بات ہے، ہم نے سیزر کو کبھی کسی غلط آدمی کو کاٹتے نہیں دیکھا اور یہ کہنا تو سراسر غلط بیانی اور تہمت طرازی ہوگی کہ وہ بالکل جنگلی یا بے لکھا تھا۔ سدھا سدھایا ضرور تھا۔ مگر صرف پچاس فی صد۔ اس اجمالِ پُر ملال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر بچّے حکم دیتے کہ جاؤ، اس راہ گیر کے پیچھے لگ جاؤ، تو یہ میرا شیر اپنی کمین گاہ سے نکل کر تعمیلاً جھپٹ پڑتا اور اس کی ٹانگ پکڑ کے لٹک جاتا۔ لیکن جب دُوسرا حکم ملتا کہ چھوڑ دو تو مجال ہے جو چھوڑ دے۔

مرزا کو مبدءِ فیّاض نے حد درجہ محتاط اور وہمی طبیعت ودیعت کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ انھیں آبِ حیات بھی پینا پڑے تو بغیر اُبالے نہیں پییں گے۔ اسی وضعِ احتیاط کے باعث انھوں نے سیزر کے آنے کے بعد ہمارے ہاں آنا جانا اتنا کم کر دیا کہ کبھی بھُولے بھٹکے آنکلتے تو ہم سب ان کی ایسی خاطر مدارات کرتے، ایسی گرمجوشی سے ملتے کہ انھیں خدشہ ہونے لگا کہ ہم قرض نہ مانگ بیٹھیں۔ ایک دن ہمارے ایماء پر پروفیسر عبدالقدوس مرزا کو طرح طرح سے سمجھانے لگے کہ کتّا بڑا بے نظیر جانور ہے۔ کتّے کے سوا کوئی جان دار پیٹ بھرنے کے بعد اپنے پالنے والے کا شکر ادا نہیں کرتا۔ غور کرو، دُم دار جانوروں میں کتّا ہی تنہا ایسا جانور ہے جو اپنی دُم کو بطور آلۂ اظہارِ خلوص و خوشنودی استعمال کرتا ہے۔ ورنہ باقی ماندہ گنوار جانور تو اپنی پونچھ سے صرف مکھیاں اُڑاتے ہیں۔ دُنبہ یہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کی

* بوگن ولیا۔ ایک زُود رو بیل جو بہت اُونچی جاتی ہے اور جس میں بہت شوخ رنگ کے پھُول آتے ہیں خصوصاً سُرخ۔

دُم صرف کھانے کے کام آتی ہے۔ البتّہ بیل کی دُم سے "ایکسی لریٹر" کا کام لیا جاتا ہے۔ مگر تھیں بیل گاڑی نخوڑی دَوڑانی ہے۔ (مرزا کے زانو پر ہاتھ مار کر) ہائے! ایک فرانسیسی ادیبہ کیا خُوب کہہ گئی ہے کہ میں آدمیوں کو جتنے قریب سے دیکھتی ہُوں، اُتنے ہی کُتّے اچھے لگتے ہیں! (لہجہ بدل کر) کُتّوں سے ڈرنا بڑی نادانی اور بُزدلی ہے۔ خصُوصًا ولایتی کُتّوں سے! پھر مرزا کا ڈر نکالنے کے لیے انہی کے کھچڑی سر کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ انگریزوں کے کُتّوں کے دانت مصنوعی ہوتے ہیں! کھانے کے اور، کاٹ کھانے کے اور! قسموں سے بھی بات بنتی نظر نہ آئی تو ہماری طرف اشارہ کر کے اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا کہ ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی تین ہفتے سے ایک دُم کٹا "کاکر اسپنیل" پلّا پال رکھا ہے۔ (کاکر اسپنیل کی مشہور پہچان معلوم ہے؟ اس کے کان اس کی ٹانگوں سے لمبے ہوتے ہیں اور ٹانگیں اتنی چھوٹی کہ زمین تک نہیں پہنچ پاتیں!) دو ہفتے تک تو بچّے دن دن بھر اسے گود میں لیے بھونکنا سکھاتے رہے۔ مگر اب ان کو اس سے ذرا دُور ہی رکھتا ہُوں۔ کیونکہ جمعہ کو چھوٹے بچّے نے کھیلتے کھیلتے اچانک اسے کاٹ کھایا۔ اپنے پہلے دانت سے۔ ابھی تک پلّے کے پنسلین کے انجکشن لگ رہے ہیں۔

پروفیسر قاضی عبدالقدّوس بے دُودھ کی کافی کے گھُونٹ لے لے کر یہ سگ بیتی سُنا رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھے سیزر کو نہ جانے کیا بھڑک اُٹھی کہ بوگن ویلیا کی اوٹ سے ان کے قیمہ بھرے سموسے پر جھپٹا۔ کافی منہ کی منہ میں رہ گئی۔ بدحواسی میں پیالی مرزا کے سر پر گری (جس سے مؤخر الذکر کی جگہ سے چٹخ گیا) اور پروفیسر مذکور گرم کافی کا غرارہ کرتے ہُوئے اپنے قد سے اُونچا پھاٹک پھلانگ گئے۔

مرزا نے پُوچھا "کُتّے سے ڈر گئے؟"

"نہیں تو!" وہ پھاٹک کے دُوسری طرف سے بڑے خُود دار لہجے میں تھر تھر کانپتے

ہوتے بولے۔

ممکن ہے یہ گفتگو کچھ دیر اور جاری رہتی، مگر موضوعِ گفتگو نے ایک ہی جست میں پروفیسر قاضی عبدالقدوس کو دبوچ لیا اور ان کی سڈول ران میں اپنے نوکیلے نوکیلے پیوست کردیے۔ وہ منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ چار پانچ دن پہلے بھی ایسی ہی گتھم گتھا ہو چکی تھی کہ کبھی کتا ان کے اُوپر اور کبھی ـــــــ اور کبھی وہ کتے کے نیچے! لہٰذا ہم نے پھر بوگن ولیا کی کانٹے دار ٹہنی توڑ کر ایک قمچی بنائی اور اس بدتمیز کو سڑاک سڑاک مارنے کو دوڑے۔ مگر پروفیسر موصوف جہاں کے تہاں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے، "للہ! یہ نہ کرو۔ ابھی تو میرے پچھلے نیل بھی نہیں مٹے!

جیسا کہ ہمارے پڑھنے والوں نے بھانپ لیا ہو گا، کتا پالنا تو ایک طرف رہا، کتوں اور پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے باہمی تعلقات کٹنے اور کٹوانے کے کامیاب تجربات سے کبھی آگے نہیں بڑھے۔ ورنہ ان کا علم الحیوانات اس حد تک کتابی یعنی ناقص ہے کہ ہمارے بچے جس دن بازار سے طوطے کا پہلا جوڑا خرید کر لائے تو اُن سے دریافت کیا چچا جان! ان میں نر کون سا ہے اور مادہ کون سی؟ فاضل پروفیسر نے چار پانچ منٹ تک سوال اور جوڑے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر بہت محتاط انداز میں فرمایا "بیٹا! یہ بہت طوطا چشم جانور ہوتا ہے۔ ابھی دو تین مہینے اور دیکھو۔ دونوں میں سے جو پہلے انڈے دینا شروع کر دے، وُہی مادہ ہو گی۔" خیر یہ لاعلمی تو انسانی معذوری سمجھ کر پھر بھی معاف کی جاسکتی ہے کیونکہ طوطا اپنی مادہ کو انسان کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے پہچان لیتا ہے، لیکن ایک دن ناصحانہ انداز میں بڑے تجربے کی بہت باریک بات یہ بتائی کہ یقین مانو، کتا رکھنے سے صحت بہتر ہو جاتی ہے! یہ سُننا تھا کہ مرزا نے اتنے زور کا قہقہہ لگایا کہ تعلقات میں فوراً بال پڑ گیا جو کئی دفعہ کافی پلانے

کے بعد دُور ہُوا۔

تعلّقات جب از سرِ نو اس درجہ خوشگوار ہو گئے کہ اب بے تبے سے گفتگو ہونے لگی تو مرزا کو تپانے کے لیے وہ پھر ثنائے سگ میں مشغول ہو گئے۔ ایک دن موج میں جو آئے تو بشارت دی کہ طبّی نقطۂ نگاہ سے کُتّا بہت مفید و مقوّی جانور ہے۔ یہ سُن کر مرزا انھیں مُسلمان نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں پر اپنے ساتھ کے ان بیمار دس کے نام گنوانے لگے، جنھیں اس نسل نے تندرستی کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ اور دُور کیوں جائیں۔ خود ان کو اپنے بالشت بھر کے پلّے سے بے انتہا فائدہ پہنچ رہا تھا۔ مرزا نے کہا "ذرا کھول کے بات کرو"۔ بولے "اب تم سے کیا پردہ۔ کُتّے کو روزانہ گوشت چاہیے۔ اور یہ ہم پر کُتّا پالنے کے بعد ہی منکشف ہُوا کہ پہلے ہمارے گھر میں روزانہ گوشت نہیں پکتا تھا اور ہم بڑی لاعلمی میں زندگی بسر کر رہے تھے!" اُن کی بناسپتی زندگی پر جو پردۂ غفلت چالیس سال سے پڑا ہُوا تھا، اُس کے دفعتہً اُٹھنے بلکہ چاک ہونے کے بعد ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ اب وہ اپنی صحت سے اس قدر مطمئن ہو گئے تھے کہ ایک نمبر بڑا جوتا پہننا شروع کر دیا تھا۔

ہم تو اس کو حُسنِ اتّفاق ہی کہیں گے کہ مدّتوں بعد پروفیسر موصوف کی تندرستی یک دم ایسی بحال ہُوئی کہ ہمیں رشک آنے لگا۔ اس لیے کہ اب وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ مہینے میں تین چار دن بغیر دوا کے رہ سکتے تھے۔ مرزا کہتے تھے کہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھیں اپنے خیالی پلّے کو صُبح شام دو تین میل ٹہلانا پڑتا ہے۔

اُونچی ذات کے کتّوں کی صحت بخش صُحبت سے پروفیسروں کی کایا پلٹ ہونا تو غیر شاعرانہ خیال آرائی ہے۔ تاہم اس کی گواہی سارا محلّہ دے گا کہ ہمارے بعض احسان فراموش

ہمسایوں کی گرتی ہوئی صحت پر سیزر کی موجودگی، خصوصاً اس کے بھونکنے کا نہایت خوشگوار اثر پڑا۔ جس کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ غریب خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے لدّھڑ سے لدّھڑ پڑوسی کی چال میں ایک عجیب چوکنّا پن، ایک عجیب چستی اور لپک جھپک پیدا ہو جاتی تھی۔ سیزر منٹوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کروا دیتا تھا۔ اوروں کا کیا ذکر، خود خواجہ شمس الدّین (امپورٹر اینڈ ایکسپورٹر) جو کہنے کو سیزر سے نالاں تھے، اُس کے فیضانِ صحت سے اپنے کو نہ بچا سکے۔ سیٹھ صاحب موصوف کم و بیش پندرہ سال سے لو بلڈ پریشر (Low Blood Pressure) کے لاعلاج مریض تھے۔ علاج معالجے، ٹونے ٹوٹکوں پر لاکھوں رُوپے صرف کر چکے تھے۔ سب بے سُود۔ اور اب یہ نوبت آ گئی تھی کہ لالچی سے لالچی ڈاکٹر بھی انھیں اپنا مستقل مریض بنانے کے لیے تیار نہ تھا۔ مبادا انھیں روز روز مطب میں بیٹھا دیکھ کر دوسرے مریض بدک جائیں کہ اس ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا نہیں۔ لیکن ہمارے پڑوس میں آنے کے تین مہینے کے اندر اندر نہ صرف یہ کہ اُن کا "بلڈ پریشر" بڑھ کر نارمل ہو گیا بلکہ بفضلہٖ اس سے بھی پندرہ بیس درجے اُوپر رہنے لگا۔

ان واقعات کا تعلّق اس دَورِ ناواقفیّت سے ہے جب ہم کتّا پالنا کھیل سمجھتے تھے۔ کینل کلب کا باقاعدہ ممبر بننے کے بعد ہمیں احساس ہُوا کہ سیزر بچارا بالکل بے قصور تھا غلطی سراسر ہماری ہی تھی کہ کُتّے کو مثل اپنی اولاد کے پال رہے تھے۔ یعنی ڈانٹ ڈپٹ کر۔ بڑے بڑے جُگادریوں سے کتّا پالنے کے ادب آداب سیکھے تو پتہ چلا کہ کُتّے کے ساتھ تو نرمی کا برتاؤ لازم ہے۔ بلکہ اس کے سامنے بچّوں کو بے دردی سے پیٹنا نہیں چاہیے ورنہ اس کی شخصیت پچک کر رہ جاتی ہے۔ اور یہاں یہ کیفیّت تھی کہ گھر کے ہر فرد نے اس پر بھونک بھونک کر اپنا گلا بٹھا لیا تھا۔ لیکن جیسے جیسے کتّا بڑا ہُوا، ہم میں بھی سمجھ آتی گئی اور ڈانٹ پھٹکار کا سلسلہ بند ہو گیا۔

سیزر ہی کے دم خم سے آٹھ نو سال تک ایسی بے فکری رہی کہ کبھی تالا لگانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اس کو ہمارے مال و اسباب کی حفاظت کا اس درجہ خیال تھا کہ شامت کا مارا کوئی کوّا یا بلّی باورچی خانے کے پاس سے بھی گزر جائے تو بھتنے بھلا کر اس بُری طرح کھدیڑتا کہ سارے چینی کے برتن ٹوٹ جاتے۔ گھر کی چوکیداری اور کام کاج میں اس طرح ہاتھ بٹانے کے علاوہ وہ ایک سمجھ دار کتّے کے دیگر فرائض بھی انجام دیتا رہا جن سے صاف ہوتے وفا آتی تھی۔ یہی نہیں کہ وہ ناشتے پر ہمارے لیے تازہ اخبار منہ میں دبا کر لاتا، بلکہ جب مہینے کی پہلی تاریخ کو اخبار والا بل لے کر آتا تو اس پر بھونکتا بھی تھا۔ اور ایک منہ میں اخبار لانے پر ہی موقوف نہیں۔ وہ تو کہیے، ہم نے خود دو تین دفعہ سختی سے منع کر دیا، ورنہ وہ تو ہمارے لیے توس بھی اسی طرح لا سکتا تھا۔ کھانے پر دونوں وقت وہ ہماری کہنی سے لگا بیٹھا رہتا اور حسبِ معمول ہم ہر پانچ لقموں کے بعد ایک لقمہ اسے بھی ڈال دیتے۔ اگر وہ اسے سونگھ کر چھوڑ دیتا تو ہم بھی فوراً تاڑ جاتے کہ ہو نہ ہو کھانا باسی ہے۔

غرض کہ بہت ہی ذہین اور خدمتی تھا۔

وقت گزرتا دکھائی نہیں دیتا۔ مگر ہر چہرے پر ایک داستان لکھ جاتا ہے۔ کل کی سی بات ہے۔ جب سیزر بچّہ سا آیا تھا تو پروفیسر قاضی عبدالقدّوس جو سدا سے یک رنگی کے قائل ہیں، اتوار کے اتوار موچنے سے اپنے سر کے سفید بال اُکھاڑا کرتے تھے۔ بال وہ اب بھی اکھاڑتے تھے، مگر صرف کالے۔ (انھیں خود بھی اپنی عمر کا احساس ہو چلا تھا اور غالباً اسی رعایت کے تحت اب صرف بال بچّوں والی عورتوں پر اُن کی طبیعت آتی تھی۔) نادان بچّوں کی وہ پہلی کھیپ جس نے سیزر کے ذریعے انگریزی سیکھی، اب ماشاءاللہ اتنی سیانی ہو چکی تھی کہ اردو اشعار کا صحیح مطلب سمجھ کر شرمانے کے قابل ہو گئی۔ سیزر بھی رفتہ رفتہ خاندان ہی کا ایک

معمر" رکن بن گیا ـــــــ اس لحاظ سے کہ اب کوئی اس کا نوٹس نہیں لیتا تھا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ بوڑھا ہو گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ دل میں اس کے لیے رفاقت و ہم سفری کا ایک احساس، دردمندی و ہم نصیبی کا ایک رشتہ پیدا ہو چلا کہ ہم نے ایک دوسرے کو بوڑھا ہوتے دیکھا تھا۔ ایک ساتھ وقت سے ہار مانی تھی۔

آج اس کی ایک ایک بات یاد آ رہی ہے۔ جوان تھا تو راہ چلتوں کا پنجے جھاڑ کر ایسا پیچھا کرتا کہ وہ کھکھیا کر قریب ترین گھر میں گھس جاتے اور بے آبرو ہو کر نکالے جاتے۔ وہ تاک میں رہتا اور نکلتے ہی اُن کے منہ اور گردن کو ہر دفعہ باندازِ دیگر یوں بھنبھوڑتا گویا جانور نہیں، کسی انگریزی فلم کا ندیدہ ہیرو ہے (یہ مرزا کے الفاظ ہیں۔ کہتے ہیں انگریزی فلموں میں لوگ یوں پیار کرتے ہیں جیسے تخمی آم چوس رہے ہیں) ابھی تین سال پہلے تک اُسے دیکھ کر پڑوسیوں کا چُلّوؤں خون سُوکھتا تھا۔ مگر اب اتنا ضعیف ہو گیا تھا کہ دن بھر بوگن ولیا کے نیچے کسی مرشدِ کامل کی طرح مراقبے میں پڑا رہتا۔ بہت ہُوا تو وہیں سے لیٹے لیٹے دُم ہلا کر شفقت کا اظہار کر دیا۔ البتّہ چھوٹے بچّوں کو، خواہ گھر کے ہوں یا پاس پڑوس کے، اُس نے کبھی مایُوس نہیں کیا۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی بچّہ اسے آواز دے کر گیند پھینکے اور وہ گُودا بھری نلی چھوڑ چھاڑ، گیند اپنے منہ میں رکھ کر واپس نہ لائے۔ اس مُعاملے میں اُسے بچّوں کی تالیفِ قلوب اس درجہ عزیز تھی کہ کئی دفعہ فٹ بال تک مُنہ میں رکھ کر لانے کی کوشش کی۔

اعضاء و جوارح رفتہ رفتہ جواب دے رہے تھے۔ ساری ٹُن پھُن غائب، غُرفش ختم۔ مرزا کے الفاظ میں اس کا بڑھاپا شباب پر تھا۔ کسی کسی دن سہ پہر تک بوگن ولیا کی چھاؤں میں وہی سنسنی خیز اردو اخبار اوڑھے اُونگھتا رہتا، جس میں نوکر صبح قیمہ بندھوا کر لایا تھا۔ چاندنی اور مادائوں کی مست مہک سے اب اس کے خون میں جوار بھاٹا نہیں آتا تھا۔ کہاں تو یہ عالم

تھا کہ "گرمی" پر آتا تو سرِ شام ہی سے زنجیر تڑا کر قدِ آدم دیوار پھاند جاتا اور فجر کی اذان کے وقت شاد کام لوٹتا۔ یا اب اس جواں دیدہ بزرگ کا یہ حال ہو گیا تھا کہ گرمائی ہوئی مادہ اور ہڈی بیک وقت نظر آجائیں تو ہڈی پر ہی جھپٹتا تھا اور جب اس ہڈی کو پوپلتے پوپلتے اس کے بوڑھے جبڑے دُکھنے لگتے تو اسے سُرخ بوگن ولیا کے نیچے دفن کر کے وضو کے لوٹے میں منہ ڈال کر پانی پینے چلا جاتا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وُہی سیزر ہے جس کے جبڑے کی مُہر محلّے کے ہر تیسرے آدمی کی پنڈلی پر آج تک گواہی دے رہی ہے کہ

اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

وہی دُم جو ایک زمانے میں بقول شخصے سوالیہ نشان کی طرح کھڑی رہتی تھی، اب مفلس کی مونچھ کی مانند لٹکنے لگی۔ اس کے ہم عمر ایک ایک کر کے وہ گلیاں سُونی کر گئے، جہاں سے راتوں کو ان دیکھے بھید بھرے جسموں کی خوشبوؤں کے بلاوے آتے تھے۔ وہ تنہا رہ گیا۔ بالکل تنہا و دل گرفتہ۔ نئی پود کے منہ زور کتّوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تو درکنار، وہ ان کے نو دولتیے مالکوں پر بھونکنا بھی اپنے رُتبے کے منافی سمجھتا تھا۔ لیکن جس دن سے ماتاہری کی جوان پٹھو ربیٹی کلو پیٹرا بھری دوپہری میں ایک حلوائی کے بے نام کتّے کے ساتھ بھاگی، وہ ہفتوں اپنے ہم جنس کی آواز تک کو ترسنے لگا۔ جب تنہائی سے بہت جی گھبرانے لگتا تو ریڈیو کے پاس آکر بیٹھ جاتا اور پکّے گانے سُن کر بہت خوش ہوتا۔

جسم کے ساتھ ساتھ نظر بھی اتنی موٹی ہو گئی تھی کہ کبھی پروفیسر قاضی عبدالقدوس اُجلے کپڑے پہن کر آجاتے تو انھیں اجنبی سمجھ کر بھونکنے لگتا۔ البتّہ سماعت میں فرق نہیں آیا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اٹکل سے گیند کا پیچھا کرتا ہے اور اس کے ٹپّا کھانے سے اس کی سمت اور محل وقوع کا اندازہ کر لیتا ہے۔ ایک دن شام کو اچھا خاصا بوگن ولیا کے نیچے اپنا مخصوص آسن

مارے (دائیں آنکھ، جو بچپن سے سُرخ رہتی تھی، آدھی بند کیے، بائیں پنجے پر تھوتھنی رکھے) بیٹھا تھا کہ ایک نیلی ربن والی بچی نے "شو" کہہ کر سڑک پر پنگ پانگ کی گیند پھینکی۔ وہ آواز کی سیدھ پر لپکا۔ مگر جیسے ہی گیند منہ میں پکڑ کے تیزی سے پلٹا، ایک کار کے بریک لگنے کی دلخراش آواز سُنائی دی۔

بچے چیختے ہُوتے دوڑے۔ سڑک پر دُور تک ٹائروں کے گھسنے سے دو سیاہ پٹیاں بن گئیں۔ کار ایک دھچکے کے ساتھ رُکی اور اپنے اسپرنگوں پر دو تین ہچکولے کھا کر غرّاتی ہوئی تیزی سے پہلے ہی موڑ پر مڑ گئی۔ مگر سیزر بیچ راستے ہی میں رہ گیا۔ اس کا پچھلا دھڑ کار کا پُورا وزن سہار چکا تھا۔ منہ سے خون جاری تھا۔ اور پاس ہی گیند پڑی تھی جو اب سفید نہیں رہی تھی۔

سب نے مل کر اسے اٹھایا اور پھاٹک کے پاس بوگن ولیا کے نیچے لٹا دیا۔ لگتا تھا، شریانوں کے منہ کھل گئے ہیں۔ اور اُس کی زندگی دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ رِس رہی ہے۔ ضرب بہ ضرب، قطرہ بہ قطرہ، دم بہ دم۔ ہر ایک اسے چھو چھو کر اُنگلیوں کی پوروں سے دل کی دھڑکن سُن رہا تھا —— وُہ دھڑکن جو دُوسری دھڑکن تک ایک نیا جنم، ایک نئی جُون بخشتی ہے۔ کس جی سے کہوں کہ اس کا آب و دانہ اُٹھ چکا تھا اور وہ رُخصت ہو رہا تھا اس ہمّت، اس حوصلے، اِس سکون کے ساتھ، جو صرف جانوروں کا مقدّر ہے۔ بغیر کراہے بغیر تڑپے، بغیر ہراساں ہُوئے۔ بس بے نور نظریں جمائے دیکھے چلا جا رہا تھا۔ باری باری سب نے اسے چمکارا۔ سر پر ہاتھ رکھتے ہی وہ آنکھیں جھکا لیتا تھا۔ اور یہ یاد کر کے سب کی آنکھیں بھر آئیں کہ اس کی زندگی میں آج پہلا موقع تھا کہ سر پر ہاتھ پھیرتے وقت وہ جواباً اپنی ریشم سی ملائم دُم نہیں ہلا سکتا تھا۔ آج اس کے نتھنوں میں ایک اجنبی خون کی بُو گھسی

جا رہی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ چار پانچ کوّے اُوپر منڈلانے لگے اور دھیرے دھیرے اتنے نیچے اُتر آئے کہ ان کے منحوس سائے اس پر پڑنے لگے۔ کچھ دیر بعد احاطے کی دیوار پر آبیٹھے اور شور مچانے لگے۔ سیزر نے ایک نظر اٹھا کر انھیں دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے نتھنے پھڑک اُٹھے۔ پھر اُس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ ہم سے یہ نہ دیکھا گیا۔ اس کا خون آلود منہ کھول کر سونے کی گولیاں کی شیشی حلق میں اُلٹ دی اور کالر اُتار دیا۔

ذرا دیر بعد وہ اپنے پیار کرنے والوں کی دُھندلاتی صورتیں دیکھتا دیکھتا ہمیشہ کے لیے سو گیا!

مارچ کے چڑھتے چاند کی بھیگی بھیگی روشنی میں جب بچّوں نے مل کر اس کی محبوب بوگن ولیا کے نیچے زمین کی امانت زمین کو سونپنے کے لیے گہرا سا گڑھا کھودا تو چھوٹی بڑی بے شمار ہڈیاں نکلیں جنھیں وہ غالباً دفن کر کے بھول گیا تھا۔ دور دور تک بوگن ولیا کی لمبی لمبی اُنگلیوں جیسی جڑیں اپنا راستہ ٹٹولتی ہوئی زمین کے نیم گرم سینے میں اُترتی چلی گئی تھیں اور اس کا رس چوس چوس کر شاخوں کے سروں پر دہکتے ہوئے پھولوں تک پہنچا رہی تھیں۔ مگر سوکھی پیاسی جڑوں کو آج سیزر کے لہو نے ان پھولوں سے بھی زیادہ سُرخ کر دیا ہوگا جو بچّوں نے لحد کا منہ اپنی سلیٹوں اور تختیوں سے بند کر کے اُوپر بکھیر دیے تھے۔ آخر میں نیلی ربن والی بچّی نے اپنی سالگرہ کی موم بتّیاں سرہانے روشن کر دیں۔ ان کی اُداس روشنی میں بچّوں کے میلے گالوں پر آنسوؤں کی نمکین اُجلی لکیریں صاف چمک رہی تھیں۔

کتنے مہینے بیت گئے۔ پت جھڑ کے بعد بوگن ولیا پھر انگارے کی طرح دہک رہی ہے مگر بچّے آج بھی اس جگہ کسی آدمی کو پاؤں نہیں رکھنے دیتے کہ وہاں ہمارا ایک ساتھی سو رہا ہے۔

اکتوبر ۱۹۶۲ء

بارے آلو کا کچھ بیاں ہو جائے

دوسروں کو کیا نام رکھیں، ہم خود بیسیوں چیزوں سے چڑتے ہیں ـــــ کرم کلا، پنیر، کمبل، کافی اور کافکا، عورت کا گانا، مرد کا ناچ، گیندے کا پھول، اتوار کا ملاقاتی، مرغی کا گوشت، پاندان، غرارہ، خوبصورت عورت کا شوہر ـــــ زیادہ حدِ ادب کہ مکمل فہرست ہماری فردِ گناہ سے بھی زیادہ طویل اور ہری بھری نکلے گی۔ گنہ گار سہی، لیکن مرزا عبدالودود بیگ کی طرح یہ ہم سے آج تک نہ ہوا کہ اپنے تعصبات پر معقولات کا نیم چڑھا کر دوسروں کو اپنی بے لطفی میں برابر کا شریک بنانے کی کوشش کی ہو۔ مرزا تو بقول کسے، غلط استدلال کے بادشاہ ہیں۔ ان کی حمایت و وکالت سے معقول سے معقول "کاز" نہایت لچر معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسی لیے ہم سب انھیں تبلیغ دین اور حکومت کی حمایت سے بڑی سختی سے باز رکھتے ہیں۔ ان کی ایک چڑ ہو تو بتائیں۔ فہرست رنگارنگ ہی نہیں، اتنی غریب پرور بھی ہے کہ اس میں اس فقیرِ بے تقصیر کا نام بھی خاصی اونچی پوزیشن پر شامل رہ چکا ہے۔ بعد میں ہم سے یہ پوزیشن بینگن کے بھرتے نے چھین لی اور اس سے جیکی کینیڈی کے دولہا اوناسس نے ہتھیا لی۔ مرزا کو آج جو چیز کل وہ دل سے اتر جائے گی اور پرسوں تک یقیناً چڑ بن جائے گی۔ لوگ ہمیں مرزا کا ہمدم، ہمراز ہی نہیں، ہمزاد بھی کہتے ہیں۔ لیکن اس یگانگت و تفرقہ کے باوجود ہم وثوق

سے نہیں کہہ سکتے کہ مرزا نے آلو اور ابوالکلام آزاد کو اوّل اوّل اپنی چڑ کیسے بنایا۔ نیز دونوں کو تہائی صدی سے ایک ہی بریکٹ میں کیوں بند کر رکھا ہے؟

بوئے یاسمن باقیست

مولانا کے باب میں مرزا کو جتنا کھُرچا، تعصب کے مُلمع کے نیچے خالص منطق کی یہ موٹی موٹی تہیں نکلتی چلی گئیں۔ ایک دن کئی وار خالی جانے کے بعد ارشاد فرمایا "ایک صاحبِ طرز انشاء پرداز نے بانیٔ ندوۃ العلماء کے بارے میں لکھا ہے کہ شبلی پہلا یونانی تھا جو مسلمانوں میں پیدا ہوا۔ اس پر مجھے یہ گرہ لگانے کی اجازت دیجیے کہ یونانیوں کی اس اسلامی نسل میں ابوالکلام آخری اہلِ قلم تھا جس نے اردو رسم الخط میں عربی لکھی!"

ہم نے کہا "ان کی شفاعت کے لیے یہی کافی ہے کہ انھوں نے مذہب میں فلسفے کا رس گھولا۔ اردو کو دینی کا سوز و آہنگ بخشا" فرمایا "ان کی نثر کا مطالعہ ایسا ہے جیسے دلدل میں تیرنا۔ اسی لیے مولوی عبدالحق علانیہ انھیں اردو کا دشمن کہتے تھے۔ علم و دانش اپنی جگہ، مگر اس کا کیا کیجیے کہ وہ اپنی انا اور اردو پر آخری دم تک قابو نہ پا سکے۔ کبھی کبھار رمضان میں ان کا ترجمان القرآن پڑھتا ہوں تو (اپنے دونوں گالوں پر تھپڑ مارتے ہوئے) نعوذ باللہ محسوس ہوتا ہے گویا کلام اللہ کے پردے میں ابوالکلام بول رہا ہے!"

ہم نے کہا "لاحول ولا قوۃ! اس بزرگ کی تمام کردہ و ناکردہ خطائیں تمہیں صرف اس بنا پر معاف کر دینی چاہییں کہ تمہاری طرح وہ بھی چائے کے رسیا تھے۔ کیا نام تھا ان کی پسندیدہ چائے کا؟ اچھا سا نام تھا۔ ہاں! یاد آیا۔ وہائٹ جیسمین! یاسمینِ سفید!" ٹھنکتے ہوئے۔ فرمایا "مولانا کا مشروب بھی ان کے مشرب کی مانند تھا۔ ٹوٹے

ہوئے بتوں کو جوڑ جوڑ کر امام الہند نے ایسا معبود تراشنے کی کوشش کی جو اہلِ سومنات کو بھی قابلِ قبول ہو۔ یونانی فلسفے کی عینک سے جب انھیں دین میں دنیا اور خدا میں ناخدا کا جلوہ نظر آنے لگا تو وہ مسلمان ہو گئے اور سچے دل سے اپنے آپ پر ایمان لے آئے۔ اسی طرح یہ چینی چائے محض اس لیے ان کے دل کو بھا گئی کہ اس میں چائے کے بجائے چنبیلی کے گجرے کی لپٹ آتی ہے۔ حالانکہ کوئی شخص جو چائے پینے کا ذرا بھی سلیقہ رکھتا ہے، اس لیے چائے پیتا ہے کہ اس میں چائے کی — فقط چائے کی — مہک آتی ہے، نہ کہ چنبیلی کے تیل کا بھبکا!"

ہم نے کہا "تعجب ہے! تم اس بازاری زبان میں اس آبِ نشاط انگیز کا مضحکہ اڑا رہے ہو، جو بقول مولانا 'طبعِ شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکرِ عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی'۔" اس جملے سے ایسے بھڑکے کہ بھڑکتے چلے گئے۔ لال پیلے ہو کر بولے "تم نے لپٹن کمپنی کا قدیم اشتہار 'چائے سردیوں میں گرمی اور گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے' دیکھا ہو گا۔ مولانا نے یہاں اسی جملے کا ترجمہ اپنے قاریوں کی آسانی کے لیے اپنی زبان میں کیا ہے!" بحث اور دل شکنی کا یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ لیکن مزید نقلِ کفر کر کے ہم اپنی دنیا و عاقبت خراب کرنا نہیں چاہتے۔ لہٰذا اس تشبیب کے بعد مرزا کی دوسری چڑ یعنی آلو کی طرف گریز کرتے ہیں۔

یہ دانت سلامت ہیں جب تک

مرزا کا "باس" دس سال بعد پہلی مرتبہ تین دن کی رخصت پر جا رہا تھا۔ اور مرزا نے اپنے مشیروں اور بہی خواہوں کو جشنِ نجات منانے کے لیے بیچ لگژری ہوٹل میں

لنچ پر مدعو کیا تھا۔ وہاں ہم نے دیکھا کہ سمندری کچھوے کا شوربہ سُڑ سُڑ پینے کے بعد مرزا
مُسلّم کیکڑے (مُسلّم کے معنی یہ ہیں کہ مرحوم کی سالم ٹانگیں، کھپرے، آنکھیں اور مونچھیں
ہیئت پر اپنی قدرتی حالت میں نظر آ رہی تھیں) پر ٹوٹ پڑے۔ ہم نے کہا "مرزا! ہم
نے تمہیں چہکا مارتی تمیری نان کھاتے دیکھا ہے، کھروں کے چٹپٹے سریش میں ڈبو ڈبو کر،
جسے تم ہلکے نہاری پائے کہتے ہو۔ مفت کی مل جائے تو سڑاندی سارڈین یوں نگلتے
ہو گویا ناک نہیں رکھتے۔ اور تو اور رنگا ماٹی میں چکما قبیلے کی ایک دوشیزہ کے ہاتھ سے
شیلاک سیلا بیک فروٹ لپ لپ کھاتے ہوئے فوٹو کھنچوا چکے ہو۔ اور اس کے بعد
پشاور میں پیڑوں کے پکوڑے کھاتے ہوئے بھی پکڑے جا چکے ہو۔ تمہارے مشربِ اکل و
شرب میں ہر شے حلال ہے سوائے آلو کے!"

کھل گئے۔ فرمایا "ہم نے آج تک کسی مولوی ــــــ کسی فرقے کے مولوی
کی تندرستی خراب نہیں دیکھی۔ نہ کسی مولوی کا ہارٹ فیل ہوتے سنا۔ جانتے ہو کیا وجہ
ہے؟ پہلی وجہ تو یہ کہ مولوی کبھی ورزش نہیں کرتے۔ دوسری یہ کہ سادہ غذا اور سبزی سے
پرہیز کرتے ہیں!"

ہوٹل، غذا اور آلو کی عملداری

سبزی نہ کھانے کے فوائد ذہن نشین کرانے کی غرض سے مرزا نے اپنی زیرِ تجربہ
زندگی سے ان گوشوں کا انتخاب کیا جو آلو سے کیمیائی طور پر متاثر ہوتے تھے۔ ذکر آلو
کا ہے۔ انہی کی زبانِ خباثت بیان سے اچھا معلوم ہوگا:۔

تمہیں تو کیا یاد ہوگا۔ میں دسمبر ۱۹۵۱ء میں ہنسٹ گری گیا تھا۔ پہلی دفعہ کراچی

سے باہر جانے کی مجبوری لاحق ہوئی تھی۔ منٹگمری کے پلیٹ فارم پر اُترتے ہی محسوس ہُوا گویا سردی سے خُون رگوں میں جم گیا ہے۔ اُدھر چائے کے اسٹال کے پاس ایک بڑے میاں گرم چائے کے بجائے ملائی کا رس پیے چلے جا رہے تھے۔ اس بندۂ خدا کو دیکھ دیکھ کر اور دانت بجنے لگے۔ کراچی کا دائمی حبس اور بغیر کھڑکیوں والا کمرہ بے طرح یاد آئے۔ قُلی اور تانگے والے سے صلاح و مشورے کے بعد ایک ہوٹل میں بستر لگا دیا، جس کا اصلی نام آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن مینجر سے لے کر مہتر تک سبھی اسے ہوٹل ہٰذا کہتے تھے۔ کمرہ صرف ایک ہی تھا جس کے دروازے پر کوئلے سے بحرُوفِ انگریزی و اردو "کمرہ نمبر ا" لکھا تھا۔ ہوٹل ہٰذا میں نہ صرف یہ کہ کوئی دوسرا کمرہ نہیں تھا، بلکہ مستقبل قریب یا بعید میں اس کی تعمیر کا امکان بھی نظر نہیں آتا تھا، کیونکہ ہوٹل کے تین طرف میونسپلٹی کی سڑک تھی اور چوتھی طرف اسی ادارے کی مرکزی نالی جو شہر کی گندگی کو شہر ہی میں رکھتی تھی، جنگل تک نہیں پھیلنے دیتی تھی۔ جزیرہ نمائے کمرہ نمبر ا میں "اٹیچڈ باتھ رُوم" تو نہیں تھا، البتہ ایک اٹیچڈ تنور ضرور تھا، جس سے کمرہ اس کڑاکے کی سردی میں ایسا گرم رہتا تھا کہ بڑے بڑے "سنٹرلی ہیٹڈ" (Centrally heated) ہوٹلوں کو مات کرتا تھا۔ پہلی رات ہم بنیان پہنے سو رہے تھے کہ تین بجے صبح جو تپش سے ایکا ایکی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ امام دین بیرا ہمارے سرہانے ہاتھ بھر لمبی خُون آلود چھُری لیے کھڑا ہے۔ ہم نے فوراً اپنی گردن پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ پھر چپکے سے بنیان میں ہاتھ ڈال کر پیٹ پر چٹکی لی اور پھر کلمہ پڑھ کے اتنی زور سے چیخ ماری کہ امام دین اچھل پڑا اور چھری چھوڑ کر بھاگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دو تین بیرے سمجھا بجھا کر اُسے واپس بُلا لائے۔ اس کے اوسان بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ چھری سے وہ ننھی ننھی بٹیریں ذبح

کر رہا تھا۔ ہم نے ایک وقار کے ساتھ کہا "عقلمند آدمی! یہ پہلے کیوں نہ بتایا؟" اس نے فوراً اپنی بھول کی معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ وہ پہلے ہی بتا دیا کرے گا کہ چھری سے بٹیر ہی ذبح کرنا چاہتا ہے۔ نیز اس نے آسان پنجابی میں یہ بھی یقین دلایا کہ آئندہ وہ چیخ سُن کر ڈرپوکوں کی طرح خوفزدہ نہیں ہُوا کرے گا۔

ہم نے رسان سے پُوچھا "تم انھیں کیوں ذبح کر رہے تھے؟" بولا "جناب! ضلع منٹگمری میں جانور کو حلال کر کے کھاتے ہیں! آپ بھی کھائیں گے؟" ہم نے قدرے ترشروئی سے جواب دیا "نہیں!" اور ریلوے ٹائم ٹیبل سے پنکھا جھلتے ہُوئے سوچنے لگے کہ جو لوگ دودھ پیتے بچّوں کی طرح جلدی سوتے اور جلدی اُٹھتے ہیں، وہ اس رمز کو کیا جانیں کہ نیند کا اصل مزا اور سونے کا صحیح لطف آتا ہی اس وقت ہے جب آدمی اٹھنے کے مقررہ وقت پر سوتا رہے کہ اسی ساعتِ دُزدیدہ میں نیند کی لذّتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اسی لیے کسی جانور کو صبح دیر تک سونے کی صلاحیت نہیں بخشی گئی۔ اپنے اشرف المخلوقات ہونے پر خود کو مُبارکباد دیتے دیتے صُبح ہو گئی اور ہم پُوری اور آلو چھولے کا ناشتہ کر کے اپنے کام پر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد معدے میں گرانی محسوس ہُوئی۔ لہٰذا دوپہر کو آلو پلاؤ اور رات کو آلو اور پنیر کا قورمہ کھا کر تنور کی گرمائی میں ایسے سوئے کہ صُبح چار بجے بیرے نے اپنے مخصوص طریقے سے ہمیں جگایا، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

ناشتے سے پہلے ہم سر جھکائے قمیض کا بٹن نوچ کر پنکوں میں ٹانکنے کی کوشش کر رہے تھے کہ سُوئی کھچ سے اُنگلی میں ٹھک گئی۔ بالکل اضطراری طور پر ہم نے اُنگلی اپنی قمیض کی جیب پر رکھ کر زور سے دبائی، مگر جیسے ہی دوسری غلطی کا احساس ہوا تو خُون کے گیلے دھبّے پر سفید پاؤڈر چھڑک کر چھپانے لگے اور دل میں سوچنے لگے کہ اللہ تعالیٰ

نے بیوی بھی کیا چیز بنائی ہے۔ لیکن انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ اپنی بیوی کی قدر نہیں کرتا۔ اتنے میں بیرا مقامی خالص گھی میں تلی ہوئی پوریاں لے آیا۔ منٹگمری کا اصلی گھی پاکستان بھر میں سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اس میں چار فی صد گھی ہوتا ہے۔ بیرے نے حسبِ معمول اپنے ابروئے تساہل سے ہمیں کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جب ہم اس پر ہم کے ہندسے کی طرح تہرے ہو کر بیٹھ گئے تو ہمارے زانو پر گیلا تولیہ بچھایا اور اس پر ناشتے کی ٹرے جما کر رکھ دی۔★ ہم نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو اسے جھاڑن منہ میں ٹھونسے بڑے ادب سے ہنستے

★ ممکن ہے بعض شکی مزاج قارئین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر کمرے میں میز یا اسٹول نہیں تھا تو بان کی چارپائی پر ناشتہ کیوں نہ کر لیا۔ تشکایتہً نہیں، اطلاعاً عرض ہے کہ جیسے ہی منٹگمری کا پہلا مرغ پہلی بانگ دیتا، بیرا ہماری پیٹھ اور چارپائی کے درمیان سے بستر ایک ہی جھٹکے میں گھسیٹ لیتا۔ اپنے زورِ بازو اور روزمرہ کی مشق سے اس کام میں اتنی صفائی اور مہارت پیدا کر لی تھی کہ ایک دفعہ سرہانے کھڑے ہو کر جو بستر گھسیٹا تو ہمارا بنیان تک اُتر کر بستر کے ساتھ لپٹ کر چلا گیا اور ہم کھرّی چارپائی پر کیلے کی طرح چھلے ہوئے پڑے رہ گئے۔ پھر چارپائی کو پائینتی سے اُٹھا کر ہمیں سر کے بل پھسلاتے ہوئے کہنے لگا، "صاب! فرنیچر خالی کرو!" وجہ یہ کہ اس فرنیچر پر سارے دن "پروپرائٹر اینڈ مینیجر ہوٹل ہٰذا" کا دربار لگا رہتا تھا۔ ایک دن ہم نے اس بے آرامی پر پُرزور احتجاج کیا تو ہوٹل کے قواعد و ضوابط کا پنسل سے لکھا ہوا ایک نسخہ ہمیں دکھایا گیا، جس کے سرورق پر "ضابطۂ فوجداری ہوٹل ہٰذا" تحریر تھا۔ اس کی دفعہ ۹ کی رُو سے فجر کی اذان کے بعد "پسنجر" کو چارپائی پر سونے کا حق نہیں تھا۔ البتہ قریب المرگ مریض، زچہ اور یہود و نصاریٰ اس سے مستثنیٰ تھے۔ لیکن آگے چل کر دفعہ ۲۸ (ب) نے ان سے بھی یہ مراعات چھین لی تھیں۔ اس کی رُو سے زچہ اور قریب المرگ مریض کو زچگی اور موت سے تین دن پہلے تک ہوٹل میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ "خلاف ورزی کرنے والوں کو بیروں کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

ہوئے پایا۔ ہم نے پوچھا "ہنس کیوں رہے ہو؟" کہنے لگا "وہ تو منیجر صاب ہنس رہے تھے۔ بولتے تھے، ہم کو لگتا ہے کہ کراچی کا پسنجر بٹیر کو تلیر سمجھ کے نہیں کھاتا!"

ہر چیز کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں۔ ایک تاریک۔ دوسرا زیادہ تاریک۔ لیکن ایمان کی بات ہے اس پہلو پر ہماری نظر بھی نہیں گئی تھی۔ اور اب اس غلط فہمی کا ازالہ ہم پر واجب ہو گیا تھا۔ پھولی ہوئی پوری کا لقمہ پلیٹ میں واپس رکھتے ہوئے ہم نے رندھی ہوئی آواز میں اس جعل ساز پرند کی قیمت دریافت کی۔ بولا "زندہ یا مُردہ؟" ہم نے جواب دیا کہ ہم تو اس شہر میں اجنبی ہیں۔ فی الحال مُردہ کو ہی ترجیح دیں گے۔ کہنے لگا "دس آنے پلیٹ ملتی ہے۔ ایک پلیٹ میں تین بٹیریں ہوتی ہیں۔ مگر جناب کے لیے تو ایک ہی راس کافی ہو گی!"

قیمت سُن کر ہمارے مُنہ میں بھی پانی بھر آیا۔ پھر یہ بھی تھا کہ کراچی میں مویشیوں کا گوشت کھاتے کھاتے طبیعت اُکتا گئی تھی۔ لہٰذا دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ جب تک منٹگمری کا آب و دانہ ہے، طیور کے علاوہ کسی چیز کے ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ لنچ پر بھُنی ہوئی بٹیر، چائے کے ساتھ بٹیر کا تنوری چرغا، سونے سے پہلے بٹیر کا آب جوش۔ اس ہانڈی تنور میں فروکش ہوئے ہمیں چوتھا دن تھا، اور تین دن سے یہی للّے تللّے تھے۔ چوتھی صبح ہم زانو پہ تولیہ اور تولیے پہ ٹرے رکھے تلی ہوئی بٹیر سے ناشتہ کر رہے تھے کہ بیرے نے جھاڑن پھر منہ میں ٹھونس لی۔ ہم نے جھک کر پوچھا "اب کیا بات ہے؟" کہنے لگا "کچھ نہیں۔ منیجر صاب ہنس رہے تھے۔ بولتے تھے کمرہ نمبر ا کے ہاتھ بٹیر لگ گئی ہے!" ہم نے طنزاً اٹیچڈ تنور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "تمہارے ہوٹل میں بٹیر کے علاوہ کون سا من و سلویٰ اُترتا ہے؟" بولا "حرام گوشت کے علاوہ دنیا بھر کی ڈش ملتی ہے۔ جو

چاہیں آرڈر کریں، جناب! ــــــ آلو مٹر، آلو گوبھی، آلو میتھی، آلو گوشت، آلو مچھی، آلو بریانی اور خدا تمہارا بھلا کرے ــــــ آلو کوفتہ، آلو بڑیاں، آلو سموسہ، آلو کا رائتہ، آلو کا بھرتا، آلو کیماں*......" ہم نے روک کر پوچھا "اور سویٹ ڈش؟" بولا "آلو کی کھیر"۔ ہم نے کہا "بھلے آدمی! تم نے تو آلو کا پہاڑہ سنا دیا۔ تمہارے ہوٹل میں کوئی ایسی ڈش بھی ہے جس میں آلو کا نام نہ آتے۔ فاتحانہ تبسم کے ساتھ فرمایا "کیوں نہیں! پوٹے ٹو کٹلٹ! حاضر کروں جناب؟"

قصہ دراصل یہ تھا کہ ایک سال پہلے مالک ہوٹل ہذا نے ہیڈ کانسٹبل کے عہدے سے سبکدوش ہو کر زراعت کی طرف توجہ فرمائی۔ اور زمین سے بھی انہی ہتھکنڈوں سے سونا اگلوانا چاہا۔ مگر ہوا یہ کہ آلو کی کاشت میں پچیس سال کی ذہانت سے جمع کی ہوئی رشوت ہی نہیں، بلکہ پنشن اور پراویڈنٹ فنڈ بھی ڈوب گئے۔

زمیں کھا گئی بے ایماں کیسے کیسے

پس انداز کیے ہوئے آلوؤں سے ہوٹل کے دھندے کا ڈول ڈالا۔ جنھیں اب اس کے بہترین دوست بھی تازہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ سنا ہے بٹیر بھی اسی زمانے میں پاس پڑوس کے کھیتوں سے پکڑ لیے تھے!

مکالمہ در مذمتِ آلو

"مرزا! یہ بٹیر نامہ اپنی جگہ، مگر یہ سوال ابھی تشنہ ہے کہ تم آلو کیوں نہیں کھاتے" ہم نے پھر وہی سوال کیا۔

* آلو قیمہ

"نہیں صاحب! آلو کھانے سے آدمی آلو جیسا ہو جاتا ہے۔ کوئی انگریز★ عورت جسے اپنا "فِگر" اور مستقبل ذرا بھی عزیز ہے، آلو کو چھوتی تک نہیں۔ سامنے "سوئمنگ پول" میں پیر لٹکائے، یہ میم جو مصر کا بازار کھولے بیٹھی ہے، اسے تم آلو کی ایک ہوائی بھی کھلا دو تو بندہ اسی حوض میں ڈوب مرنے کو تیار ہے۔ اگر یہ کافی میں چینی کے چار دانے بھی ڈال لیتی ہے، یا کوئی اسے میٹھی نظر سے بھی دیکھ لے، تو اس کی کیلوریز+ کا حساب اپنی دھوبی کی کاپی میں رکھتی ہے"۔ انھوں نے جواب دیا۔

"مرزا! کیا میمیں بھی دھوبی کی کاپی رکھتی ہیں؟"

"ہاں! ان میں کی جو کپڑے پہنتی ہیں، وہ رکھتی ہیں!"

ہماری تشنگیِ علم بڑھتی دیکھ کر مرزا نے آلو کی ہجو میں دلائل و نظائر کا طومار باندھ دیا۔ جہاں کہیں منطق کے ٹاٹ میں ذرا سا سوراخ بھی نظر آیا، وہاں مخملی مثال کا بڑا سا پیوند اس طرح لگایا کہ جی چاہتا تھا کچھ اور سوراخ ہوتے۔ کہنے لگے کرنل شیخ کل رات ہی یورپ سے لوٹے ہیں۔ کہہ رہے تھے یورپ کی اور ہماری خواتین میں بڑا فرق ہے۔ یورپ میں جو لڑکی دور سے سترہ برس کی معلوم ہوتی ہے وہ قریب پہنچ کر ستر برس کی نکلتی ہے اور ہمارے ہاں جو خاتون دور سے ستر برس کی دکھلائی پڑتی ہے وہ نزدیک آنے پر سترہ برس کی نکلتی ہے! مگر یہ وضعداری انگلستان میں ہی دیکھی کہ جو عمر دور سے نظر آتی

★ انگریز: مرزا کی عادت ہے کہ تمام سفید فام غیر ملکیوں کو انگریز کہتے ہیں۔ مثلاً امریکہ کے انگریز، جرمنی کے انگریز، حد یہ کہ انگلستان کے انگریز۔

+ کیلوریز: حرارے۔ غذائی اکائیاں۔

ہے وہی پاس سے۔ چنانچہ مذکور نک بالوں والی جو لڑکی دُور سے اُنیس سال کی نظر آتی ہے وہ پاس جانے پر بھی اُنیس ہی سال کا "پہیّا" نکلتا ہے! خیر سُنی سُنائی باتوں کو چھوڑو۔ اِس میم کا مقابلہ اپنے ہاں کی آلو خور خواتین سے کرو۔ ادھر فانوس کے نیچے، سُرخ ساری میں جو محترمہ لیٹر بکس بنی اکیلے اکیلے گپا گپ بیف اسٹیک اور آلو اڑا رہی ہیں۔ اماں! گنواروں کی طرح انگلی سے اشارہ مت کرو۔ ہاں! ہاں! وہی۔ ارے صاحب! کیا چیز تھی! لگتا تھا ایک اپسرا سیدھی اجنتا کے غاروں سے چلی آرہی ہے اور کیا فگر تھا۔ کہتے ہوئے زبان سو سو بل کھاتی ہے۔

چلتی تو قدم یُوں رکھتی تھی دن جیسے کسی کے پھرتے ہیں

پہلے پہل مارچ ۱۹۵۱ میں دیکھا تھا۔ وہ صبح یاد آتی ہے تو کوئی دل پر دستک سی دینے لگتا ہے۔ اور اب؟ اب تمھاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ بارہ سال پہلے کی Go-Go Girl گوشت کے انبار میں کہیں کھو گئی ہے۔ عشق اور آلو نے اِن حالوں کو پہنچا دیا۔

ہم نے کہا "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ!" بولے "اہلِ زبان کے محاورے انھی کے خلاف اندھا دُھند استعمال کرنے سے پہلے پُوری بات تو سُن لیا کرو۔ حمیرہ وہ آئیڈیل عورت تھی، جس کے خواب ہر صحت مند آدمی دیکھتا ہے ——— یعنی شریف خاندان، خوبصورت اور آوارہ! اردو، انگریزی، فرنچ اور جرمن فراٹے سے بولتی تھی، مگر کسی بھی زبان میں "نہ" کہنے کی قدرت نہیں رکھتی تھی۔ حُسن اور جوانی کی بشرکتِ غیرے مالک تھی۔ یہ دونوں اشیائے لطیف جب تبرک ہو گئیں اور پلکوں کے سائے گھرے ہو چلے تو ملازے باندھے ایک عقدِ شرعی بھی گیا۔ مگر ایک مہینے کے اندر ہی دُولہا نے عرُوسی کمر بند کا پھندا گلے میں ڈال کر خود کشی کر لی۔ جا تجھے کشمکشِ عقد سے آزاد کیا۔ پھر تو ایسے کان ہوئے

کہ اس بچاری نے شرعی تکلفات سے خود کو کبھی مکلف نہیں کیا۔ صاحب! مرد کا کیا ہے آج کل مرد زندگی سے اُکتا جاتا ہے تو شادی کر لیتا ہے۔ اور اگر شادی شدہ ہے تو طلاق دے دیتا ہے۔ لیکن عورت ذات کی بات اور ہے۔ بدی پہ آئی ہوئی عورت جب پریشان یا پشیمان ہوتی ہے تو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے بقول گراموفون ریکارڈ لگا کر اپنے جوڑے کو میکانکی انداز سے تھپتھپاتے ہوئے خواب گاہ میں بولائی بولائی نہیں پھرتی، بلکہ غذا سے غم غلط کرتی ہے۔ حمیرہ نے بھی مرد کی بے وفائی کا مقابلہ اپنے معدے سے کیا۔ تم خود دیکھ لو۔ کس رفتار سے آلو کے قتلے قاب سے پلیٹ اور پلیٹ سے پیٹ میں منتقل کر رہی ہے۔ بس اسی نے صورت سے بے صورت کر دیا۔

ہم نے اُن کا وقت اور اپنی رہی سہی عزت بچانے کی خاطر ان کی اس 'تھیوری' سے جھٹ اتفاق کر لیا کہ زنانہ آوارگی کی روک تھام کے لیے عقد اور آلو سے بہتر کوئی آلہ نہیں کہ دونوں سے بدصورتی اور بدصورتی سے نیک چلنی زور پکڑتی ہے۔ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ہم نے کہا "لیکن اگر آلو سے واقعی مُٹاپا پیدا ہوتا ہے تو تمھارے حق میں تو اُلٹا مفید ہوگا۔ کیوں کہ اگر تمھارا وزن صحیح مان لیا جائے تو معیاری حساب سے تمھارا قد تین فٹ ہونا چاہیے۔ ایک دن تمھیں نے بتایا تھا کہ آستین کے لحاظ سے ۱۷ نمبر کی قمیض تمھیں فٹ آتی ہے اور کالر کے لحاظ سے ۱۳ نمبر!"

کرشمے کاربوہائیڈریٹ کے

اسی سال جون میں مرزا اپنے دفتر میں اگاتا کرسٹی کا تازہ ناول پڑھتے پڑھتے اچانک بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آیا تو خود کو ایک آرام دہ کلینک (CLINIC) میں کمپنی

کے خرچ پر صاحبِ فراش پایا۔ انھیں اس بات سے سخت مایوسی ہوئی کہ جس مقام پر انھیں دل کا شدید درد محسوس ہوا تھا، دل اس سے بالشت بھر دُور نکلا۔ ڈاکٹر نے وہم دُور کرنے کی غرض سے اُنگلی رکھ کر بتایا کہ دل یہاں نہیں، یہاں ہوتا ہے۔ اس کے بعد انھیں دل کا درد دل ہی میں محسوس ہونے لگا!

جیسے ہی ان کے کمرے سے "مریض سے ملاقات منع ہے" کی تختی ہٹی، ہم زینیا کا گلدستہ لے کر عیادت کو پہنچے۔ دونوں ایک دُوسرے کی شکل دیکھ دیکھ کر خوب روئے۔ نرس نے آکر دونوں کو چُپ کرایا اور ہمیں علیحدہ لے جا کر متنبّہ کیا کہ اس اسپتال میں بیمار پرسی کرنے والوں کو رونا اور کراہنا منع ہے۔ ہم نے فوراً خود پر فرمائشی بشاشت طاری کر کے مرزا کو ہراساں ہونے سے منع کیا اور تلقین کی کہ مریض کو اللہ کی رحمت سے مایُوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ چاہے تو تنکے میں جان ڈال دے۔ ہماری نصیحت کا خاطر خواہ بلکہ اس سے بھی زیادہ اثر ہوا۔

"تم کیوں روتے ہو پگلے؟" ہم نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا۔

"یُونہی خیال آگیا کہ اگر تم مر گئے تو میری عیادت کو کون آیا کرے گا!" مرزا نے اپنے آنسُو نرس کے رُومال میں محفوظ کرتے ہُوئے وجہِ رقّت بیان کی۔

مرض کی اصل وجہ ڈاکٹروں کے نزدیک کثرتِ افکار تھی جسے مرزا کی زبانِ قادرالبیان نے کثرتِ کار بنا دیا۔ خیر، اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں تھی۔ تعجب کی بات تو یہ تھی کہ مرزا چائے کے ساتھ آلُو کے "چپس" اُڑا رہے تھے۔ ہم نے کہا "مرزا! آج تم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے"۔ بولے (اور ایسی آواز میں بولے گویا کسی اندھے کنوئیں کے پیندے سے بول رہے ہیں) "ڈاکٹر کہتے ہیں تمھارا وزن بہت کم ہے تمھیں

آلو اور ایسی چیزیں خوب کھانی چاہییں جن میں "اسٹارچ" اور "کاربوہائی ڈریٹ" کی افراط ہو۔ صاحب! آلو ایک نعمت ہے، کم از کم سائنس کی رُو سے!" ہم نے کہا "تو پھر دبادب آلو کھا کر ہی صحت یاب ہو جاؤ" فرمایا "صحت یاب تو مجھے ویسے بھی ہونا ہی پڑے گا۔ اِس لیے کہ یہ نرسیں اِس قدر بدصُورت ہیں کہ کوئی آدمی جو اپنے منہ پہ آنکھیں رکھتا ہے، یہاں زیادہ عرصے پڑا نہیں رہ سکتا!"

وُہ نئے گلے، وُہ شِکایتیں، وُہ مزے مزے کی حِکایتیں

کلینک سے نکلتے ہی مرزا نے اپنی توپوں کا رُخ پھیر دیا۔ خوگرِ ہجو کے شب و روز اب آلو کی تعریف و توصیف میں بسر ہونے لگے۔ ایک وقت تھا کہ ویت نام پر امریکی بمباری کی خبریں پڑھ کر مرزا پچھتایا کرتے کہ کولمبس نے امریکہ دریافت کر کے بڑی نادانی کی۔ مگر اب پیار میں آتے تو آلو کی گدرائی ہوئی گولائیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرماتے "صاحب! کولمبس جہنّم میں نہیں جائے گا۔ اُسے واپس امریکہ بھیج دیا جائے گا! مہذّب دُنیا پر امریکہ کے دو احسان ہیں: تمباکو اور آلو۔ سو تمباکو کا بیڑا تو سرطان نے غرق کر دیا۔ مگر آلو کا مستقبل نہایت شاندار ہے۔ جو ملک جتنا غربت زدہ ہوگا، اُتنا ہی آلو اور مذہب کا چلن زیادہ ہوگا۔"

اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حریفِ ظریف سائنسی ہتھیاروں سے زیر نہیں ہوا تو شاعری کی مار سے وہیں ڈھیر کر دیتے۔ "صاحب! جُوں جُوں وقت گزرتا ہے، یادداشت کمزور ہوتی جاتی ہے۔ پہلے اپنی پیدائش کا دِن ذہن سے اُترا۔ پھر مہینہ۔ اور اب تو سنہ بھی یاد نہیں رہتا۔ بیگم یا کسی بدخواہ سے پُوچھنا پڑتا ہے۔ اکثر تمھارے لطیفے

تمھیں ہی سنانے بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ تو جب تم پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگتے ہو تو شک گزرتا ہے کہ لطیفہ تمھارا ہی ہوگا۔ بیگم اکثر کہتی ہیں کہ کاک ٹیل پارٹیوں اور ڈانس میں تمھیں یہ تک یاد نہیں رہتا کہ تمھاری شادی ہو چکی ہے! غرض کہ حافظہ بالکل چوپٹ ہے۔ اب یہ آلو کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے کہ آج بھی کسی بچے کے ہاتھ میں بھوبل میں سنکا ہوا آلو نظر آجائے تو اس کی مانوس مہک سے بچپن کا ایک ایک واقعہ ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔ میں ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھتا ہوں۔ اس سے پھوٹتی ہوئی سوندھی بھاپ کے پرے ایک بھولی بسری صورت ابھرتی ہے۔ گرد آلود بالوں کے پیچھے شرارت سے روشن آنکھیں۔ کرتا بٹنوں سے بے نیاز۔ گلے میں غلیل۔ ناخن دانتوں سے کترے ہوئے۔ پتنگ اڑانے والی انگلی پر ڈور کی خون آلود لکیر۔ بیری سہمے ہولے ہولے اپنی کینچلیاں اتارتا چلا جاتا ہے۔ اور میں ننگے پاؤں تتلیوں کے پیچھے دوڑتا، رنگ برنگے بادلوں میں ریزگاری کے پہاڑ، پریوں اور آگ اگلتے اژدہوں کو بنتے بگڑتے دیکھتا ——— کھڑا رہ جاتا ہوں ...."

"یہاں تک کہ آلو ختم ہو جاتا ہے"! ہم نے صابن کے بلبلے پر پھونک ماری۔ سنبھلے۔ گردشِ ایام کو اپنے بچپن کے پیچھے دوڑاتے دوڑاتے لگام کھینچی۔ اور گالی دینے کے لیے گلا صاف کرتے ہوئے فرمایا "........ خدا جانے حکومت آلو کو بزورِ قانون قومی غذا بنانے سے کیوں ڈرتی ہے۔ سستا اتنا کہ آج تک کسی سیٹھ کو اس میں ملاوٹ کرنے کا خیال نہیں آیا۔ اسکنڈل کی طرح لذیذ اور زود ہضم! وٹامن سے بھرپور، خوش ذائقہ، صوفیانہ رنگ، چھلکا زنانہ لباس کی طرح۔ یعنی برائے نام صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو"

دستِ خود دہانِ خود

مرزا پر اب یہ جھک سوار تھی کہ اگر صندل کا گھسنا اور لگانا دردِ سر کے لیے مفید ہے تو اسے اُگانا کہیں زیادہ مفید ہونا چاہیے۔ حکمت و زراعت کی جن پُرخار راہوں کو مستانہ طے کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچے، ان کا اعادہ کیا جائے تو طِب پر ایک ٹھُرّی کتاب مرتّب ہو سکتی ہے۔ ازبسکہ ہم حکیموں کی لگی لگائی روزی پہ ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتے، اس لیے دو تین چنگاریاں چھوڑ کر دور کھڑے ہو جائیں گے۔

ایک دن ہم سے پوچھا "بچپن میں کھٹ مِٹھّے بیر، میرا مطلب ہے جھَر بیری کے بیر کھائے ہیں؟" عرض کیا "جی ہاں! ہزار دفعہ۔ اور اتنی ہی دفعہ کھانسی میں مبتلا ہُوا ہُوں"۔ فرمایا "بس یہی فرق ہے، خرید کے کھانے میں اور اپنے ہاتھ سے توڑ کے کھانے میں۔ تجربے کی بات بتاتا ہوں۔ بیر توڑتے وقت انگلی میں کانٹا لگ جائے اور خُون کی بُوند پور پر تھرتھرانے لگے تو آس پاس کی جھاڑیوں کے تمام بیر میٹھے ہو جاتے ہیں!"

"سائنٹیفک دماغ میں یہ بات نہیں آتی" ہم نے کہا۔

ہمارا یہ کہنا تھا کہ زیادہ اُبلے ہُوئے آلُو کی طرح تڑخنے بکھرتے چلے گئے۔ کہنے لگے "صاحب! بعضے حکیم یہ کرتے ہیں کہ جس کا معدہ کمزور ہو اُسے اوجھڑی کھلاتے ہیں۔ جس کے گُردوں کا فعل درست نہ ہو اُسے گُردے۔ اور جو ضعفِ جگر میں مُبتلا ہو اُسے کلیجی۔ اگر میں حکیم ہوتا تو تمھیں مغز ہی مغز کھلاتا!"

راقم الحروف کے عضوِ ضعیف کی نشاندہی کرنے کے بعد اِرشاد ہُوا "اب

آلو خود کاشت کرنے کی سائنٹیفک وجہ بھی سُن لو۔ پچھلے سال اُترتی برسات کی بات ہے۔ میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں کالے تیتر کی تلاش میں کچے میں بہت دور نکل گیا۔ مگر ایک تیتر نظر نہ آیا، جس کی وجہ "گائیڈ" نے یہ بتائی کہ شکار کے لیے آپ کے پاس ڈپٹی کمشنر کا پرمٹ نہیں ہے۔ واپسی میں رات ہو گئی اور ہماری ۱۹۴۵ ماڈل جیپ پر دمے کا دَورہ پڑا۔ چند لمحوں بعد وہ ضعیفہ تو ایک گڑھے میں آخری ہچکی لے کر خاموش ہو گئی مگر اپنے قفسِ عنصری میں ہمارے طائرِ رُوح کو پرواز کرتا چھوڑ گئی۔ ہم اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ رحمتِ ایزدی سے جیپ گڑھے میں گری، ورنہ گڑھے کی جگہ کنواں ہوتا تو اس وقت خدا کا شکر کون ادا کرتا؟ نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا! ہمارے قرض خواہوں پر کیا گزرتی؟ ہمارے ساتھ رقم کے ڈوبنے پر انھیں کیسے صبر آتا کہ ابھی تو ہمارے تمسّک کی روشنائی بھی خشک نہیں ہوئی تھی؟ ہم ابھی اُن کے اور اُن کے چھوٹے چھوٹے بچّوں کے سروں پر ہاتھ پھیر ہی رہے تھے کہ ایک کسان بکری کا نوزائیدہ بچّہ گردن پر مفلر کی طرح ڈالے ادھر سے گزرا۔ ہم نے آواز دے کر بُلایا۔ ابھی ہم اتنی ہی تمہید باندھنے پائے تھے کہ ہم کراچی سے آئے ہیں اور کالے تیتر کی تلاش میں ہیں کہ وہ گڑھے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تیتر پانی میں نہیں رہتے۔ ہمارے گائیڈ نے ہماری فوری ضرورت کی ترجمانی کی تو وہ ایسا پسیجا کہ اپنی بیل گاڑی لانے اور اسے جیپ میں جوت کر اپنے گھر لے جانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ اور وہ بھی بلا معاوضہ! صاحب! اندھا کیا چاہے؟ ......"

"دو آنکھیں!" ہم نے جھٹ لقمہ دیا۔

"غلط! بالکل غلط! اگر اس کی عقل بھی بینائی کے ساتھ زائل نہیں ہوئی ہے تو اندھا دو آنکھیں نہیں چاہتا، ایک لاٹھی چاہتا ہے!" مرزا نے محاورے کی بھی اِصلاح فرما دی۔

ہم ہُونکارا بھرتے رہے، کہانی جاری رہی "تھوڑی دیر بعد وہ بیل گاڑی لے آیا جس کے بیل اپنی جوانی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اَدوان کی رسّی سے جیپ باندھتے ہُوئے اس نے ہمیں بیل گاڑی میں اپنے پہلو میں اگلی سیٹ کی پیش کش کی۔ اور ڈیڑھ دو میل دُور کسی موہُوم نقطے کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے تسلّی دینے لگا:

"او جیہڑی نویں لالٹین بلدی پئی اے نا، اوہی میرا گھار دے" ★

گھر پہنچتے ہی اُس نے اپنی پگڑی اُتار کر چارپائی کے سیروے والے پائے کو پہنا دی۔ منہ پر پانی کے چھپکے دیے اور گیلے ہاتھ سفید بکری کی پیٹھ سے پُونچھے۔ برسات کی چاندنی میں اس کے کُرتے پر بڑا سا پیوند دُور سے نظر آ رہا تھا۔ اور جب کھُونٹی پر لٹکی ہُوئی نئی لالٹین کی لَو بھڑکی تو اس پیوند میں لگا ہُوا ایک اور پیوند بھی نظر آنے لگا جس کے ٹانکے ابھی اس کی مسکراہٹ کی طرح اُجلے تھے۔ اس کی گھر والی نے کھُرّی چارپائی پر کھانا چن کر ٹھنڈے میٹھے پانی کے دو دھات کے گلاس پٹّی پر بان چھدرا کر کے جما دیے۔ میزبان کے شدید اصرار اور بھوک کے شدید تر تقاضے سے مجبُور ہو کر جو ہم نے خشک چُنائی شرُوع کی ہے تو یقین مانو پیٹ بھر گیا مگر جی نہیں بھرا۔ رال ٹپکتے ہُوئے ہم نے پُوچھا 'چودھری! اس سے مزے دار آلُو کا ساگ ہم نے آج تک نہیں کھایا۔ کیا ترکیب ہے پکانے کی؟'

★ وُہ جہاں نئی لالٹین جل رہی ہے نا۔ وُہی میرا گھر ہے۔

بولا' بادشاہو! پہلے تے اِک کلے زمین وِچ پنج من امریکہ دی کھاد پاؤ - فیر .... ★

قِصّہ آلو کی کاشت کا

بات اگر اب بھی گلے سے نہیں اُتری تو "خود اگاؤ، خود کھاؤ" سلسلے کی تیسری داستان سُنیے جس کا عذاب ثواب مرزا کی گردن پر ہے کہ وہی اس کے فردوسی ہیں اور وہی رستم۔ داستان کا آغاز یوں ہوتا ہے:

"صاحب! بازار سے سڑے بُسے آلو خرید کر کھانے سے تو یہ بہتر ہے کہ آدمی چنے بھسکتا پھرے۔ پرسوں شام ہم خُود آلو خریدنے گئے۔ شُبراتی کی دُکان سے۔ ارے صاحب! وہی اپنا شبراتی جس نے چودہ پندرہ سال سے وہ سائن بورڈ لگا رکھا ہے:

مالکِ ایں دُکان شبراتی مہاجرین
(گر کوئی دعوٰی کند باطل شود)
بمقام موضع کا ٹھ، عقب جامع مسجد کلاں
پوسٹ آفس قصبہ باغپت، ضلع میرٹھ۔
حال مقیم کراچی۔

ہم نے ایک آلو دِکھلاتے ہوئے کہا" میاں شبراتی! حال مقیم کراچی! تمھارے آلو تو پلپلے ہیں۔ خراب لگتے ہیں"۔ بولا" باؤجی! خراب نکلیں تو کالا ناگ (اُس کے گدھے

★ پہلے ایک ایکڑ زمین میں پانچ من امریکی کھاد ڈالو پھر ....
(اُس زمانے میں کیمیائی کھاد امریکہ سے آتی تھی۔)

کا نام) کے نوٹ سے مونچھ منڈوا دینا۔ درحقیقت میں یہ پہاڑی آلو ہیں"۔ ہم نے کہا "ہمیں تو کراچی سے پانچ سو میل تک کوئی پہاڑ نقشے میں نظر نہیں آتا" بولا "باؤجی! تمہارے نشقے میں اور کون سی پھل پھلاری کرانچی میں نجر آوے ہے؟ یہ رُپے چھٹانک کا سانچی پان جو تمہارے غلام کے کلّے میں بتاشے کی طریوں گھُل ریا ہے، بمقام بنگال سے آریا ہے۔ یہاں کیا دم درُود رکھّا ہے۔ حالیت تو یہ ہے باؤجی! کرانچی میں رمٹّی تلک ملیر سے آوے ہے۔ کس واسطے کہ اس میں ڈھاکہ سے منگا کے گھانس لگا دیں گے۔ جوانی قسم باؤجی! پشاور کے چوک یادگار میں مُرغا اذان دیوے ہے تو کہیں جا کے کرانچی والوں کو صبح انڈا نصیب ہووے ہے!"

اور ایک مردِ غیرت مند نے چمن زار کراچی کے دل یعنی ہاؤسنگ سوسائٹی میں آلو کی کاشت شروع کر دی۔ اگرچہ سرِدست پانچ من امریکی کھاد کا انتظام نہ ہو سکا، لیکن مرزا کا جوشِ جنوں انھیں اس مقام پر پہنچا چکا تھا، جہاں کھاد تو کھاد، وہ بغیر زمین کے بھی کاشت کرنے کا جگرا رکھتے تھے!

مرزا عبدالودود بیگ اور کھیتی باڑی! ہمارا خیال ہے کہ سارا کھیت ایئر کنڈیشن کر دیا جائے اور ٹریکٹر میں ایک راکنگ چیئر (جھولا کرسی) ڈال دی جائے تو مرزا شاید دو چار گھنٹے کے لیے کاشت کاری کا پیشہ اختیار کر لیں، جس کے بارے میں ان کا مبلغ علم بس اس قدر ہے کہ انھوں نے سینما کے پردے پر کلین شیو ایکٹروں کو چھاتی پہ مصنوعی بال چپکائے، اسٹوڈیو کے سورج کی دھوپ میں، سگریٹ کی پنّی چڑھی ہوئی درانتیوں سے باجرے کے کھیت میں سے مکّا کے بھٹّے کاٹتے دیکھا ہے۔ یہاں یہ بتانا غالباً بے محل نہ ہو گا کہ اس سے چند سال پیشتر مرزا باغبانی کا

ایک انتہائی نادر اور اتنا ہی ناکام تجربہ کر کے ہمیں ایک مضمون کا خام مواد مہیا کر چکے تھے۔ انھیں ایک دن اپنے کوٹ کا ننگا کالر دیکھ کر دفعتہً القا ہوا کہ ہونے کو تو گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے سوائے روپے کے، لیکن اگر باغ میں گلاب کے گملے نہیں تو جینا فضول ہے۔ انھیں زندگی میں اچانک ایک زبردست خلا محسوس ہونے لگا جسے صرف امریکی کھاد سے پُر کیا جا سکتا تھا۔

اب جو آلو کی کاشت کا سودا سر میں سمایا تو ڈیڑھ دو ہفتے فقط اس موضوع پر ریسرچ ہوتی رہی کہ آلو بخارے کی طرح آلو کے بھی بیج ہوتے ہیں، یا کوئٹہ کے گلاب کی طرح آلو کی بھی ٹہنی کاٹ کر صاف ستھرے گملے میں گاڑ دی جاتی ہے۔ نیز آیا پٹ سن کی مانند گھٹنوں گھٹنوں پانی مانگتا ہے یا اخروٹ کی طرح بغیر محنت کے پُشت پُشت تک پھل دیتا رہے گا۔ دورانِ تحقیق ایک شق کہیں سے یہ بھی نکل آئی کہ بینگن کی طرح آلو بھی ڈال ڈال پہ لٹکیں گے یا ترئی کی بیل کی طرح پڑوسی کی دیوار پہ پڑے رہیں گے۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے تو یہ شوشہ بھی اٹھایا کہ اگر رفع شر کی خاطر یہ مان لیا جائے کہ آلو واقعی زمین سے اُگتے ہیں تو ڈنٹھل کا نشان کیسے مٹایا جاتا ہے؟

چھپا دستِ ہمّت میں دستِ قضا ہے

پھر کیا تھا۔ کوئٹہ سے بذریعہ پی۔آئی۔اے سفید گلاب کی قلمیں منگائی گئیں۔ گملوں کو کھولتے پانی اور فنائل سے "ڈِس انفکٹ" کیا گیا۔ پھر کوئٹہ کے نازک دنیا گلاب کو کراچی کی دیمک اور کیڑوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اوباش بکری کی مینگنی کی گرم کھاد میں اتنی ہی امریکی کھاد اور امریکی کھاد میں ہموزن ڈی۔ڈی۔ٹی پاؤڈر ملایا گیا

اُبلے ہُوئے پانی سے صُبح و شام سینچائی کی گئی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ان گملوں میں کبھی کوئی کیڑا نظر نہیں آیا۔ اور نہ گلاب!

پروفیسر قاضی عبدالقدّوس کچُھ غلط تو نہیں کہتے کہ مرزا حماقت بھی کرتے ہیں تو اس قدر "اوریجنل" کہ بخدا بالکل الہامی معلُوم ہوتی ہے!

پایانِ کار مرزا نے آلُو کی کاشت کے لیے زمین یعنی اپنا "لان" (جس کی افریقی گھاس کی ہریالی ایسی تھی کہ سگرٹ کی راکھ جھاڑتے ہُوئے دل دُکھتا تھا) تیار کیا۔ اس زراعتی تجربے کے دوران جہاں جہاں عقل محوِ تماشائے لبِ بام رہی، وہاں جوشِ نمرُود بے خطر گلزارِ خلیل میں کُود پڑا۔ دفتر کے چپراسیوں، اپنے پالتُو خرگوش اور محلّے کے لونڈے لاڑھیوں کی مدد سے دو ہی دن میں سارا لان کھود پھینکا۔ بلکہ اس کے بعد بھی یہ عمل جاری رکھا۔ یہاں تک کہ دُوسری منزل کے کرایہ داروں نے ہاتھ پاؤں جوڑ کے کھُدائی رُکوائی، اس لیے کہ مکان کی نیو نظر آنے لگی تھی۔

$$\frac{\text{س} + \text{ک} \times \text{موزہ}}{\text{۳۲}} = \text{کم}$$

کوئٹہ کے گلاب کی طرح آلُو کو بھی کراچی کی نظر کھا گئی۔ مگر پنج وقتہ نلائی، گوڑائی اور کھُدائی سے رگ پٹھوں میں جو چُستی اور طبیعت میں جو چونچالی آگئی تھی، وہ اُسے آلُو کی کرامات سمجھتے تھے۔ اب کی دفعہ جو لنچ پر ہمیں ہوٹل انٹر کانٹی ننٹل کے چاندنی لاونج میں لے گئے تو ہم نے دیکھا کہ بُوفے میز پر سوائے ان کیمیائی تجربات کے جو یورپین باورچیوں نے نسلاً بعد نسلٍ آلُو پر کیے تھے اور کچُھ نہ تھا ——— آلُو مُسلّم، آلُو دو نیم، آلُو سوختہ و کوفتہ، آلُو چھلکے دار، آلُو بریاں، آلُو نیم بریاں، بلکہ کہیں کہیں

بالکل عُریاں!

"مرزا! یہ کیا؟"

"ٹرپل بی (Busy Businessmen's Buffet)"

"یا اللہ! کراچی کے کروڑپتی یہ کھاتے ہیں! مگر ہم نے تو اِنکم ٹیکس کی چوری بھی نہیں کی۔ پھر یہ سزا کیوں؟ بھُوکا ہی مارنا تھا تو ہمیں گز بھر کی ٹائی باندھوا کے نَو منزلیں لانگتے پھلانگتے یہاں کاہے کو لائے؟ نیچے ہی نقد پیسے دے کر رخصت کر دیتے۔"

"ہماری صحبتیں اُٹھاتے ایک عُمر گزری، مگر رہے جنگلی کے جنگلی! تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ 'فایو اسٹار' (اعلیٰ درجہ) ہوٹلوں میں قیمت کھانے کی نہیں دی جاتی، اس رُومانی فضا کی دی جاتی ہے، جہاں آپ دُوسرے معزّزین کو اپنی طرح بھُوکا مرتا دیکھتے ہیں۔ بِل میں جو رقم درج ہوتی ہے وہ بساندے گوشت اور اُبلے چقندر کی قیمت نہیں ہوتی۔ دراصل اس میں گھر سے بھاگنے کا جُرمانہ، دُوسری میزوں پر بیٹھی ہُوئی خواتین کے فرنچ سینٹ لگانے کا تاوان، کھلکھلاتی ہُوئی ویٹرس کے ٹُوتھ پیسٹ کی قیمت ہی نہیں بلکہ اس کا پُورا نان نفقہ شامل کرنا پڑتا ہے، جب جا کے کہیں ایک بِل بنتا ہے۔ اور جہاں تک لذّت کا تعلّق ہے تو صاحب! ہر شب آنگن میں اُترنے والے من و سلویٰ کے مقابلے میں باہر کی پیاز کی گنٹھی مزا دے جاتی ہے۔ ورنہ دیکھا جائے تو چائے کی پیالی گھر کی انگیٹھی پر "چراغ تلے" جلا کر بھی بنائی جا سکتی ہے اور ______ اور صاحب! دس دس روپے کے نوٹ جلا کر بھی! جیسا ہاکس بے کی "ہٹ" میں تمھارے اُس ببیا سیٹھ نے کیا تھا! مصری بیلی ڈانسر کی خاطر۔"

"مگر وُہ تو خاصی PLUMP تھی"۔

"صاحب! مصری تو اسی چیز پر جان دیتے ہیں۔ جبھی تو شاہ فارُوق فربہ اندام داشتائیں اس طرح اکٹھی کیا کرتا تھا جیسے بچے ڈاک کے ٹکٹ جمع کرتے ہیں!"

بحث اور ہمیں اس ڈھلوان پر لاکر مرزا نے سراپا کے اعدادِ ثلاثہ (مثلاً ۳۷-۲۴-۳۵) کی جانچ پڑتال کرنے کا خود ساختہ فارمولا پیش کیا جو بے کم و کاست نذرِ قارئین ہے:-

نازنین کے سینے کے ناپ میں کُولھوں کا ناپ جوڑو۔ میزان کو اپنے (صاف) موزے کے نمبر سے ضرب دو۔ پھر اس حاصل ضرب کو ۳۲ سے تقسیم کر دو۔ جو جواب آئے وہ کمر کا مثالی ناپ ہوگا۔ اب اگر کمر کا پھیر اس سے زیادہ نکلے تو آلو سے پرہیز لازم ہے اور اگر اس سے کم ہے تو آلو کھلا کھلا کر جسم کو فارمولے کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

ہوٹل کے بل کی پُشت پر انھوں نے بال پائنٹ قلم سے مارلن منرو، جینا لولو بریجیڈا، الزبتھ ٹیلر، صوفیہ لارین اور چیدہ چیدہ پری پیکروں کو ایک ایک کر کے اپنے گیارہ نمبر کے موزے میں ایسا اُتارا کہ ہم بھونچکے رہ گئے۔ اس میں آپ کو جھوٹ یا عبارت آرائی کا ذرا بھی شائبہ نظر آئے تو دو چار مشقی سوال نکال کر آپ بھی اپنی جان پہچان کے حسینوں کا امتحان کر لیجیے۔ ہم تو اسے ملکہ وکٹوریہ کے بُت، کوکا کولا کی بوتل اور خود پر آزما کر اپنا اطمینان کر چکے ہیں۔

......اُس کی شبوں کا گُداز

ہمیں ڈیڑھ مہینے کے لیے کام سے ڈھاکہ جانا پڑا اور مرزا سے ملاقاتوں کا سلسلہ

موقوف ہو گیا۔ خط و کتابت کا مرزا کو دماغ نہیں۔ جیسے ہی ہم واپس آئے، انناس اور منشی گنج کے کیلوں سے لدے پھندے مرزا کے ہاں پہنچے۔ ہم نے کہا "السلام علیکم!" جواب ملا "پھل اندر پہنچوا دو۔ وعلیکم السلام"! غور سے اُن کی صورت دیکھی تو دل پہ چوٹ سی لگی۔

"یہ کیا حال بنا لیا تم نے؟"

"ہمیں جی بھر کے دیکھ لو۔ پھر اس صورت کو ترسو گے۔ اشتہا ختم۔ دواؤں پر گزارا ہے۔ دن بھر میں تین انگور کھا پاتا ہوں۔ وہ بھی چھلکا اتار کے۔ کھانے کے نام سے ہول اٹھتا ہے۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔ ہر وقت ایک بیکلی سی رہتی ہے۔ ہر چہرہ اُداس اداس، ہر شے دُھواں دُھواں۔ یہ ہونکتا سناٹا، یہ چیت کی اُداس چاندنی، یہ ....."

"مرزا! ہم تمھیں رومینٹک ہونے سے روک تو نہیں سکتے لیکن یہ مہینہ چیت کا نہیں ہے"۔

"چیت نہ سہی، چیت جیسا ضرور ہے، ظالم۔ تم تو ایک ہندو لڑکی سے دل بھی لگا چکے ہو۔ تمھیں بتاؤ، یہ کون سے مہینے کا چاند ہے؟" مرزا نے سوال کیا۔

"اسی مہینے کا معلوم ہوتا ہے" ہم نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"ہمیں بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ صاحب! عجیب عالم ہے۔ کام میں ذرا جی نہیں لگتا۔ اور بیکاری سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ ذہن پراگندہ بلکہ سچ پوچھو تو محض گندہ۔ تاروں بھرے آسمان کے نیچے رات رات بھر آنکھیں پھاڑے تمھاری حماقتیں گنتا رہتا ہوں۔ تنہائی سے دل گھبراتا ہے۔ اور لوگوں سے ملتا ہوں تو جی چاہتا ہے منہ نوچ لوں، اور صاحب!

ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں

"مرزا! ہو نہ ہو، یہ عشق کے آثار ہیں!"

"بجا۔ لیکن اگر صاحب معاملہ پر چالیس مہاوٹیں پڑ چکی ہوں، تو یہ آثارِ عشق کے نہیں، 'السر' کے ہیں۔ کھانا کھاتے ہی محسوس ہوتا ہے گویا کسی نے حلق سے لے کر معدے تک تیزاب کی پھریری پھیر دی ہے۔ اِدھر کھایا، اُدھر پیٹ پھول کر مشکیزہ ہوا۔ ہنسی کا رُخ بھی اندر کی طرف ہو گیا ہے۔ سارا فتور آلو کا ہے۔ معدے میں 'ایسڈ' بہت بننے لگا ہے۔ 'پیپٹک السر' ہو گیا ہے۔" ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"اس میں ہراساں ہونے کی کیا بات ہے۔ آج کل کسی کو 'ہارٹ اٹیک' یا 'السر' نہ ہو تو لوگ اس پر ترس کھانے لگتے ہیں کہ شاید بیچارہ کسی ذمّہ دار عہدے پر فائز نہیں ہے! مگر تم تو ملازمت کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہو۔ اپنے 'باس' سے ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے بات کرتے ہو۔ پھر یہ کیسے ہوا؟ وقت پر سوتے ہو۔ وقت کے بعد اُٹھتے ہو۔ دادا کے وقتوں کی چاندی کی پتیلی میں اُبالے بغیر پانی نہیں پیتے۔ وضو بھی پانی میں 'لسٹرین' ملا کر کرتے ہو، جس میں ۲۶ فی صد الکحل ہوتا ہے۔ حالاتِ حاضرہ سے خود کو بے خبر رکھتے ہو۔ باتوں کے علاوہ کسی چیز میں تُرشی کو روا نہیں رکھتے۔ تیل بھی تم نہیں کھاتے۔ دس سال سے تو ہم خود دیکھ رہے ہیں، منٹگمری کا خالص دانے دار گھی کھا رہے ہو۔" ہم نے کہا۔

"تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ یہ سب اسی منحوس کا فتور ہے۔ اب کی دفعہ جو سونے کے کشتہ سے زیادہ طاقت بخش گھی، کا سربمہر کنستر اپنے ہاتھ سے انگیٹھی پر تپایا تو معلوم ہے تہ میں کیا نکلا؟ تین تین اُنگل آلو کی دانے دار لگدی! جبھی تو میں کہوں کہ میرا بنیان تو تنگ ہو گیا، مگر وزن کیوں نہیں بڑھ رہا!" مرزا نے آخر اپنے دس سالہ مرض

کی جڑ پکڑ لی، جو ضلع منٹگمری تک پھیلی ہوئی تھی۔

کیا اسیری ہے، کیا رہائی ہے

پہلے مرزا کو درد کی ذرا برداشت نہیں تھی۔ ہمارے سامنے کی بات ہے پہلی دفعہ پیٹ میں درد ہوا تو ڈاکٹر نے مارفیا کا انجکشن تیار کیا۔ مگر مرزا نے گھگھیا کر منتیں کیں کہ انھیں پہلے کلوروفارم سنگھا دیا جائے تاکہ انجکشن کی تکلیف محسوس نہ ہو! لیکن اب اپنی بیماری پر اس طرح اترانے لگے تھے جیسے اکثر اوچھے اپنی تندرستی پر اکڑتے ہیں۔ ہمیں ان کی بیماری سے اتنی تشویش نہیں ہوئی جتنی اس بات سے کہ انھیں اپنے ہی نہیں پرائے مرض میں بھی اتنی ہی لذّت محسوس ہونے لگی تھی۔ بھانت بھانت کی بیماریوں میں مبتلا مریضوں سے اس طرح کرید کرید کر متعدّی تفصیلات پوچھتے کہ رات تک ان کے سارے مرض اپنا لیتے۔ اِس حد تک کہ بخار کسی کو چڑھتا، سرسامی باتیں وہ کرتے۔ اِس ہمدردانہ طرزِ عیادت سے مرزا نے خود کو زچگی کے سوا ہر قسم کی تکلیف میں مبتلا کر لیا۔ گھر یا دفتر کی قید نہیں، نہ اپنے بیگانے کی تخصیص، ہر ملاقاتی کو اپنی آنتوں کے ناقص فعل سے آگاہ کرتے اور اس سیماب صفت ریاحی درد کا لفظی گراف بناتے جو مصافحہ کرنے وقت نفخ و قراقر کا محرّک تھا۔ پھر دائیں آنکھ کے پپوٹے میں "کرنٹ" مارتا، متورّم جگر کو چھیدتا، ٹلی ہوئی ناف کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ پچھلے پہر اچانک پلٹا اور پلٹ کر دل میں بُرے بُرے خیال پیدا کرنے لگا۔ اور پھر مرزا ہر بُرے خیال کو اس طرح کھول کر بیان کرتے کہ

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جن لوگوں نے مرزا کو پہلے نہیں دیکھا تھا وہ تصوّر نہیں کر سکتے تھے کہ یہ مرد بیمار

جو فائلوں پر سر جھکائے، اُلسر کی ٹپک مٹانے کے لیے ہر دُوسرے گھنٹے ایک گلاس دُودھ مُنہ بنا کر پی لیتا ہے، یہ چار مہینے قبل کوفتے میں ہری مرچ بھر وا کر کھاتا تھا اور اس سے بھی جی نہیں بھرتا تو شام کو یہی کوفتہ ہری مرچ میں بھروا دیتا تھا۔ یہ نیم جاں جو بے مرچ مسالے کے راتب کو "انگلش فوڈ" کہہ کر صبر و شکر کے ساتھ کھا رہا ہے، یہ وہی چٹورا ہے جو چار مہینے پہلے یہ بتا سکتا تھا کہ صبح سات بجے سے لے کر رات کے نو بجے تک کراچی میں کس "سویٹ میٹ مرچنٹ" کی کڑھائی سے اُترتی گرم جلیبی مل سکتی ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کے کون سے چینی ریستوراں میں تلے ہُوئے جھینگے کھانے چاہییں جن کا چوگنا بل بناتے وقت مالک ریستوراں کی بیٹی اس طرح مُسکراتی ہے کہ بخدا روپیہ ہاتھ کا میل معلوم ہوتا ہے۔ انھیں نہ صرف یہ پتہ تھا کہ لاہور میں زیورات کی کون سی دُکان میں نہایت سبک "ہیرا تراش" کلائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں، بلکہ یہ بھی معلوم تھا کہ مزنگ میں تکا کباب کی وہ کون سی دکان ہے جس کا ہیڈ آفس گوجرانوالہ میں ہے اور یہ بھی کہ کڑکڑاتے جاڑوں میں رات کے دو بجے لال کُرتی کی کس پان کی دُکان پر پنڈی کے من چلے طرح طرح کے پانوں سے زیادہ ان کے رسیلے ناموں کے مزے لُوٹنے آتے ہیں۔ قصہ خوانی کے کس مجھیل حلوائی کی دُکان سے کالی گلاب جامن اور ناظم آباد کی کون سی چورنگی کے قریب گلاب میں بسا ہُوا قلاقند قرض پر مل سکتا ہے* (اطلاعاً عرض ہے کہ مرزا نقد پیسے دے کر مٹھائی خریدنا فضول خرچی سمجھتے ہیں) بھلا کوئی کیسے یقین کر لیتا کہ یہ آلو اور "کاربوہائی ڈریٹ" کا شکار وہی ہے جس نے کل تک من بھاتے کھانوں کے

* یہ بے مطلب معلومات مرزا کے ملک گیر چٹورپن کا نچوڑ ہیں۔ اُنھوں نے ساری عمر اور کیا ہی کیا ہے۔ اپنے دانتوں سے اپنی قبر کھودی ہے۔

کیسے کیسے البیلے جوڑے بنا رکھے تھے ——— کھڑے مسالے کے پسندے اور بیسنی روٹی، قیمہ بھرے کریلے اور گھی میں ترتراتے پراٹھے، مدراسی بریانی اور پارسی کوفتے۔ (وہ بھی ایک لکھنوی پڑوسن کے ہاتھ کے) چپڑی روٹی اور اُڑد کی بھُربھری دال، بھنڈی اور ——— بھنڈی! (بھنڈی کے ساتھ مرزا کسی اور چیز کو شامل کرنے کے روادار نہیں)

مرزا کو کھانے کا ایسا ہَوکا ہے کہ ایک مُنہ انھیں ہمیشہ ناکافی معلوم ہوتا ہے! ان کے ندیدے پن کو دیکھ کر ایک دفعہ پروفیسر قاضی عبدالقدّوس نے کہا تھا "مرزا! تمھارا حال گرگٹ جیسا ہے۔ اس کی زبان کی لمبائی اس کے جسم کی آدھی ہوتی ہے!" مرزا کی اُداس آنکھیں ایک دم مُسکرا اُٹھیں۔ کہنے لگے "صاحب! خُدا نے ایک پارۂ گوشت کو جانے کس لذّت سے ہمکنار کر دیا۔ اگر سارا بدن اس لذّت سے آشنا ہو جاتا تو اِنسان اس کی تاب نہ لاتا۔ زمین کی چھاتی پھٹ جاتی!"

مرزا پانچ چھ ہفتے میں پلنگ کو لات مار کر کھڑے ہو گئے۔ ہم تو اسے اُن کی قوّتِ ارادی کی کرامات ہی کہیں گے، حالانکہ وہ خود کچھ اور وجہ بتاتے تھے۔ ایک دن اُن کے معدے سے خُون کٹ کٹ کر آنے لگا۔ ہمیں چشمِ پُرآب دیکھا تو ڈھارس دینے لگے "میں مُسلمان ہُوں۔ جنّت کا بھی قائل ہُوں۔ مگر مجھے وہاں جانے کی جلدی نہیں ہے۔ میں مَوت سے نہیں ڈرتا۔ مگر میں ابھی مر نہیں سکتا۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ اوّل تو تم میری موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکو گے۔ دوم، میں پہلے مر گیا تو تم مجھ پر مضمُون لکھ دو گے!" خُدا بہتر جانتا ہے کہ وُہ خوفِ خاکہ سے صحت یاب ہُوئے یا بقولِ شخصے مُرغِ کے غُسلِ میّت کے پانی سے جسے وُہ چکن سوپ کہہ کر نوشِ جان فرما رہے تھے۔ بہر حال،

بیماری جیسے آئی تھی، اُسی طرح چلی گئی۔ فائدہ یہ ہُوا کہ آلُو سے جو بیزاری پہلے بلا وجہ تھی، اب اس کی نہایت معقول وجہ ہاتھ آگئی۔ اور یہ سراسر مرزا کی اخلاقی فتح تھی۔

مرض الحمدللہ دور ہو چکا تھا۔ پرہیز البتّہ جاری تھا۔ وہ اس طرح کہ پہلے مرزا دوپہر کے کھانے کے بعد آدھ سیر جلیبی اکیلے کھا جاتے تھے۔ لیکن اب ڈاکٹروں نے میٹھا بند کر دیا تھا۔ لہٰذا آدھ سیر امرتی پر اکتفا کرتے تھے۔

آلُو کا مُنہ کالا، بِھنڈی کا بول بالا

جیسے ہی مرزا کی صحت اور طبیعت معمول پر آئی، بغدادی جم خانہ میں یار لوگوں نے شایانِ شان پیمانے پر غسلِ صحت کے جشن کا اہتمام کیا۔ استقبالیہ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ گھِسے پِٹے ڈِنر ڈانس کے بجائے فینسی ڈریس بال کا اہتمام کیا جائے تاکہ ایک دُوسرے پر ہنسنے کا موقع ملے۔ مہمانِ خصوصی تک یہ بھنک پہنچی تو اُنھوں نے ہماری زبانی کہلا بھیجا کہ نئے مضحکہ خیز لباس سلوانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ممبران اور ان کی بیگمات اگر ایمانداری سے وہی کپڑے پہنے پہنے جم خانہ چلے آئیں، جو وہ عموماً گھر میں پہنے بیٹھے رہتے ہیں تو منشاء پُورا ہو جائے گا۔ رقص کے لیے البتّہ ایک کڑی شرط مرزا نے یہ لگا دی کہ ہر ممبر صرف اپنی بیوی کے ساتھ رقص کرے گا، مگر اس لپک اور ٹھسک سے گویا وہ اس کی بیوی نہیں ہے! جشن کی رات جم خانہ کو جھنڈیوں اور بھنڈیوں سے دُلہن بنایا گیا۔ سات کورس کے ڈِنر سے پہلے رُوئی اور کاغذ سے بنے ہُوئے ایک قدِ آدم آلُو کی ارتھی نکالی گئی، جس پر مرزا نے اپنے ہاتھ سے برانڈی چھڑک کر ماچس دِکھائی اور سُرگباشی کے "ڈیمپل" پر گاف کلب مار کے کِریا کرم کیا۔ ڈِنر کے بعد مرزا پر ٹائلٹ پیپر کے پھول برسائے

گئے اور کچّی کچّی بھنڈیوں میں تولا گیا جن پر ابھی ٹھیک سے سُنہری رُواں بھی نہیں نکلا تھا۔ پھر یہ بھنڈیاں مُستحقین یعنی معدے کے لکھ پتی مریضوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ شمپین سے مہکتے ہُوئے بال رُوم میں غبارے چھوڑے گئے۔ خالی بوتلوں کی قیمت کا عطیّہ ایک یتیم خانے کو دینے کا اعلان کیا گیا۔ اور غُسلِ صحت کی خوشی میں کارڈ روم والوں نے جُوئے کے اگلے پچھلے سارے قرضے معاف کر دیے۔

مرزا بات بے بات مُسکرا رہے تھے۔ تیسرا رقص ختم ہوتے ہی ہم اپنی کہنیوں سے راستہ بناتے ہُوئے اُن تک پہنچے۔ وہ اس لمحے ایک بڑے غبارے میں چلتے ہوئے سگرٹ سے سُوراخ کرنے چلے تھے کہ ہم نے اس کا ذکر چھیڑ دیا جس کی جناب میں کل تک گُستاخیٔ فرشتہ پسند نہ تھی۔ ”مرزا! آلو اگر اتنا ہی مضر ہے تو انگلینڈ میں اس قدر مقبول کیوں ہے؟ ایک انگریز اوسطاً دس اونس آلو یومیہ کھا جاتا ہے۔ یعنی سال میں ساڑھے پانچ من۔ اُسن رہے ہو، ساڑھے پانچ من!“ بولے ”صاحب! انگریز کی کیا بات ہے! اس کی مفلسی سے بھی ایک شان ٹپکتی ہے۔ وہ پِٹتا بھی ہے تو ایک ہیکڑی کے ساتھ! لن یو تانگ نے کہیں لکھا ہے کہ ہم چینیوں کے بارے میں لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ قحط پڑتا ہے تو ہم اپنے بچّے تک کھا جاتے ہیں۔ لیکن خُدا کا شکر ہے کہ ہم انھیں اس طرح نہیں کھاتے جس طرح انگریز ”بیف“ کھاتے ہیں یعنی کچّا!“ ہم بھی جواباً کچھ کہنا چاہتے تھے کہ ایک نکیلی ایڑی جو ایک حسین بوجھ سہارے ہُوئے تھی، ہمارے پنجے میں برمے کی طرح اُترتی چلی گئی۔ ہماری مردانہ چیخ

FOR HE IS A JOLLY GOOD FELLOW

کے کورس میں دب گئی۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے کا برمی ساگوان کا ڈانس فلور بہکے بہکے قدموں تلے پھر چرچرانے لگا۔

(۱۹۶۵-۱۹۶۸)

پروفیسر

آج پھر اُن کے اعزاز میں حضرت رنجور اکبر آبادی، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر و پروف ریڈر، سہ ماہی "نیا اُفق" نے ایک عصرانہ دیا تھا۔

جس دن سے پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔ اے، بی۔ ٹی گولڈ میڈلسٹ (مرزا سے روایت ہے کہ یہ طلائی تمغہ انھیں مڈل میں بلاناغہ حاضری پر ملا تھا) یونیورسٹی کی ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد بنک آف چاکسو لمیٹڈ میں بحیثیت ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز اینڈ ایڈورٹائزنگ دھانس دیے گئے تھے، اُن کے اعزاز میں اس قسم کے عصرانے، استقبالیے اور عشائیے روزمرہ دفتری زندگی کا جُزو بلکہ جُزوِ بدن بن گئے تھے۔ گھر پر اکلِ حلال تو صرف دورانِ علالت ہی زہر مار فرماتے تھے، ورنہ دونوں وقت "اعزازیہ" کھاتے تھے۔ بنک کی ملازمت پروفیسر موصوف کے لیے ایک عجیب تجربہ ثابت ہوئی، جس کی قیمت وہ بہرطور مہینے کی تیس تاریخ کو وصول کر لیتے تھے۔

معاف کیجیے، اس خاکے میں ہم انھیں پروفیسر ہی کہیں گے۔ بقول مرزا، آدمی ایک دفعہ پروفیسر ہو جائے، تو عمر بھر پروفیسر ہی کہلاتا ہے، خواہ بعد میں سمجھ داری کی باتیں ہی کیوں نہ کرنے لگے۔ درس و تدریس تو ایک حیلۂ شرعی تھا، ورنہ بقول مولانا محمد حسین آزاد، پروفیسر کا "پیشہ توکّل تھا اور بے دماغی سے اُسے رونق دیتے تھے"

وہ کسی کے دبیل نہیں تھے۔ دبنگ اور دلیر آدمی تھے اور خطرے سے ڈرنا یا بچنا تو کجا، بسا اوقات سانپ کو رسّی سمجھ کر گُتھ مرتے تھے۔ ان کی جرأت اب شجاعت سے گزر کر تہوّر، اور تہوّر سے گزر کر حماقت کی ماورائی حدوں میں داخل ہو چکی تھی۔ کوئی شخص اُن سے ملازمت، بحث یا برج میں سبقت لے جائے تو اس کے پورے صوبے سے نفرت ہو جاتی تھی۔ برّصغیر ہند و پاکستان کا کوئی صوبہ بچا ہوگا، جس سے ان کی ذاتی عداوت نہ ہو۔ بلکہ اب تو چھوٹی چھوٹی تحصیلیں آنکھیں دکھلانے لگی تھیں۔

وائس چانسلر کو بھری میٹنگ میں ''شٹ اپ'' کہنے کے بعد وہ تین مہینے کی رخصت لے کر گھر بیٹھ گئے۔ اور احتجاجاً اخبار تک پڑھنا ترک کر دیا کہ اس میں گاہے ماہے وائس چانسلر کی تصویر چھپ جاتی تھی۔ یُوں بھی انھوں نے زندگی بھر زبان کے علاوہ کسی دُوسرے عضو کو تکلیف نہیں دی تھی، لیکن اب چوبیس گھنٹے میں ایک دفعہ بلا کی پھرتی دکھاتے تھے۔ وہ اس وقت بھی دن بھر آرام کرسی پر اُونگھتے رہنے کے بعد وہ شام کو آٹھ بجے سونے کے لیے بڑی پھرتی سے جست لگا کر پلنگ پر چڑھتے تھے۔ اپنے پیشے سے تنگ آ چکے تھے اور کہتے تھے کہ تمھارا خیال آجاتا ہے ورنہ اکثر جی میں آتا ہے کہ گھر★ کو آگ لگا کر کسی غیر آباد جزیرے میں ایک لوٹا، ڈور، فروٹ سالٹ اور دیوانِ غالب لے کر چلا جاؤں۔

عالمِ بیزاری میں ایک دن پاک بوہیمین کافی ہاؤس✝ میں نتھنوں کی چمنی سے KING STORK سگریٹ کا دُھواں خارج کرنے کے بعد کرسی پر اکڑوں بیٹھ گئے اور

★ یہ گھر یُونیورسٹی کا تھا۔ اور جس فرنیچر سے آراستہ تھا اس کا سال بھر کا کرایہ چڑھا ہُوا تھا۔

✝ PAK BOHEMIAN COFFEE HOUSE جہاں مرزا روزانہ شام کو لونڈھار مچائے رکھتے ہیں۔

مُٹھی بھینچ کر کہنے لگے :

"اگر میں اس ملک کا پرائم منسٹر ہوتا تو ۔ ۔ ۔ ۔"

"تو ۔ ۔ ۔ ۔ ؟" ہم نے پُوچھا۔

"تو یُونیورسٹی میں نوکری نہیں کرتا!" اُنھوں نے مُٹھی کھول دی۔

وہ پرائم منسٹر ضرور ہونا چاہتے تھے، مگر جس مقدار میں وہ ذہنی سکون اور فُرصت چاہتے تھے، وہ ہمارے ہاں صرف پرائمری اسکول کے ماسٹر کا حصّہ ہے۔ "فراغتے و کتابے" کا جہاں اتنا عمل دخل ہو تو آپ خود قیاس فرما سکتے ہیں کہ مُعلّمی کا پیشہ چھڑوانے میں ہمیں کیسے کیسے سبز باغ دکھانے پڑے ہوں گے۔ لیکن اس کارِ ثواب میں ہمیں زیادہ جھُوٹ نہیں بولنا پڑا، اِس لیے کہ علم و ادب سے بیزار کرنے میں عُلمائے جامعہ نے ایسا مؤثر کردار ادا کیا کہ پروفیسر کا دل اپنے کسب سے کھٹا ہو گیا۔ دورانِ رُخصت خبر آئی کہ یونیورسٹی نے ان کے ایک "جُونیئر" کو ۱۸۵۷ء میں دلّی کے سودا بیچنے والوں کی آوازوں پر رِیسرچ کرنے سات سمندر پار لندن بھیجا ہے۔ پروفیسر نے اسی وقت ہمارے بیٹے کی چار لائن والی کاپی پر استعفیٰ لکھ کر بیرنگ پوسٹ کر دیا اور اپنا نامکمل تھیسس "چاکسو (خورد) کا دبستانِ شاعری" (جس کا موضوع ان شعراء کا کلام تھا، جن کی ولادت کہیں اور ہونے کے بجائے چاکسو خُورد میں ہو گئی تھی) پھاڑ کر پھینک دیا۔ اس تھیسس کے پندرہ سال تک اُدھورے رہنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بعض ایسے شعراء جن پر وہ تبصرہ کرنا چاہتے تھے، اُن کے انتقال میں ابھی خاصی دیر معلوم ہوتی تھی۔

تو یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب پروفیسر اپنی بوسیدہ کشتی جلا ہی نہیں چکے تھے بلکہ اس کی راکھ سے تو بہ بصارت زمانے موڑھوں کے من کی آنکھیں کھولتے پھرتے تھے!

کلاس روم سے بنک تک پہنچنے میں پروفیسر کو کِس صراطِ غیر مستقیم سے گزرنا پڑا، یہ اُن کا دل جانتا ہے یا ہم۔ اِس کا ذکر کسی نامناسب موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ بنک کی افسری سے اُن کے کندھوں کا پروفیسرانہ خم تو دُور نہ ہُوا، مگر بہت سی اور خوشگوار تبدیلیاں، کچھ از خود کچھ اَوروں کے کہنے سُننے سے اُن کی شخصیت میں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ اب تک اُن کی شخصیت SELF-MADE (خود ساختہ) تھی۔ یعنی اس میں اُنھوں نے درزی، دھوبی، ڈاکٹر اور نائی کو اصلاح کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ پروفیسری کے ابتدائی ایام میں جب لڑکے بالکل لڑکوں ہی کی سی حرکتیں کرنے لگے تو ہم سب نے صلاح دی کہ لب و لہجہ میں ڈپٹ اور شخصیت میں رُعب داب پیدا کرو۔ دُوسرے ہی دن انھوں نے جُوتوں میں پَون انچ موٹا تلا لگوا لیا اور اُونچی باڑھ کی ٹوپی پہننی شروع کر دی، جس سے قد تو خیر کیا بڑھتا، البتہ خُودی اِتنی بلند ہو گئی کہ ہم نے انھیں بادشاہی مسجد کے دروازے سے جھک کر نکلتے دیکھا۔ رائی زورِ خُودی سے پربت بن چکی تھی۔ کردار بھی اُن کا اپنا نہیں رہا تھا۔ شاہین کی خصلت اختیار کر لی تھی۔ یعنی بار بار اپنے موضوع اور مخاطب پر

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا

جھوٹ کیوں بولیں، ہم نے کبھی شاہین نہیں دیکھا۔ اللہ جانے اُس کے مونچھیں ہوتی ہیں یا نہیں۔ بہرحال اُنھوں نے رکھ لی تھیں جو برابر تاؤ دیتے دیتے کاگ کھولنے کے اسکریو جیسی ہو گئی تھیں۔ دائیں مونچھ ہمیشہ سفید رہتی تھی۔ اس لیے کہ بلیک بورڈ پر سفید چاک سے لکھتے لکھتے اسی ہاتھ سے مونچھ کو تاؤ دیتے رہتے تھے۔ اور یہ عادت اتنی راسخ ہو چکی تھی کہ حالانکہ بنک میں آتے ہی [illegible] خط ملتے ہی مونچھ کا صفایا کر دیا، لیکن بے چین چٹکی سے مہینوں اُس جگہ کو تاؤ دیتے رہتے جہاں کبھی مونچھ ہوا کرتی تھی۔ ان تبدیلیوں کا یہ اثر ہوا کہ لڑکوں نے

ان کے لیکچر کی فاش غلطیوں پر ہنسنا چھوڑ دیا۔ اب ان کے حلیے پر ٹھٹھے لگاتے تھے۔

تقرر کے تین مہینے بعد بنک نے پروفیسر کو تعلقاتِ عامہ اور ایڈورٹائزنگ کی تربیت کے لیے چھ ہفتے کے کورس پر پیرس بھیجنے کے احکام صادر کیے۔ اور یہ بھی پیش کش کی کہ اگر آپ اپنی بیگم کو ہمراہ لے جائیں تو ہمیں عین مسرت ہوگی۔ دونوں کے فرسٹ کلاس ٹکٹ اور ہوٹل کے جملہ اخراجات بنک کے ذمّے ہوں گے۔ خط ملتے ہی دماغ میں شہنائیاں بجنے لگیں۔ کراچی کی ان تمام خواتین کی، جن کے جملہ حقوق ہنوز غیر محفوظ تھے، ایک مکمّل فہرست ہم سے بنوائی اور پھر بسور گئے کہ سرِدست ان میں سے کسی ایک سے دو بول پڑھوا دو تاکہ ٹکٹ بیکار نہ جائے اور ہنی مون مفت پڑے۔ اگر مرزا نے ایک ہی فقرے سے ان کے ذہن کی ساری گرہیں نہ کھول دی ہوتیں تو خدا جانے کب تک ہماری جان کو آئے رہتے۔ فرمایا "بیوی کو پیرس ڈھو کر لے جانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ایورسٹ سر کرنے نکلے اور تھرماس میں گھر سے برف کی ڈلی رکھ کر لے جائے!"

پیرس (جسے اب وہ پیار میں "پیری" کہنے لگے تھے) سے لوٹنے کو تو لوٹ آئے لیکن دماغ وہاں کے قہوہ خانوں اور دل قحبہ خانوں میں چھوڑ آئے۔ جسدِ خاکی کو پاکستان میں گھسیٹے پھر رہے تھے۔ سامنے نادہندوں کے بہی کھاتے کھلے پڑے ہیں، مگر آنکھوں میں وہی کتابی چہرے پھر رہے ہیں

کہ دیکھیں جن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

ایک ایک سے پوچھتے تھے پاکستان میں انقلابِ فرانس کب آئے گا؟ اس انقلاب کی پذیرائی کے لیے وہ اپنی پتلون کی "کریز" استرے کی دھار جیسی بنائے رکھتے تھے۔ پرانی وضع کی غرارے نما پتلونوں کے پائنچے ان کی ہمشیرہ نے گاؤ تکیوں پر بطور غلاف چڑھا لیے

اور اُن کی اُونچی باڑھ کی ٹوپی سے ایک خوبصورت ٹی کوزی بنائی، جسے اُٹھاتے ہی ان کا سر یاد آ جاتا تھا۔ پہلے اپنے والدِ ماجد کو بھی خط لکھتے تو آخر میں "تابعدار" پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔اے، بی۔ٹی، "گولڈ میڈلسٹ" لکھ کر، گولڈ میڈلسٹ کے نیچے احتیاطاً خط کھینچ دیا کرتے تھے کہ بندہ بشر ہے، مبادا نظر چُوک جائے۔ لیکن اب کاغذ پہ کلیجہ نکال کے رکھ دینے کے بجائے بنکروں کے طرز پر دستخط کی جگہ ایک جلیبی سی بنا دیا کرتے تھے، جس کی نقل کم از کم کاغذ پر کوئی حلوائی بھی نہیں کر سکتا۔ کالر میں دھوبی سے خاص طور پر کلف لگواتے۔ خود بھی انگریزی تلفّظ میں خُوب کلف لگانے لگے تھے۔ دلدّر دُور ہوتے ہی وقت کی پابندی بھی تکلیف دہ حد تک کرنے لگے۔ جب سے اندھیرے میں وقت بتلانے والی قیمتی گھڑی خرید کر لائے تھے، انھیں دن سے سخت اُلجھن ہونے لگی تھی۔ فرشی نشست کے بچپن سے عادی تھے۔ وہ ترک تو نہیں کی، لیکن اب گاؤ تکیے کا سہارا لے کر نہیں بیٹھتے تھے۔ اسے گود میں لے کر بیٹھتے تھے۔ مختصر یہ کہ "پرسنیلٹی" نکل آئی تھی۔ بیل گاڑی میں جیٹ لڑاکا ہوائی جہاز کا اِنجن لگ گیا تھا۔

مُدیرِ سہ ماہی "نیا اُفق" جسے انھوں نے بہ عصرانہ ترتیب دیا تھا، شعر کا عجب مذاق رکھتے ہیں۔ شعر کو غلط پڑھ کر اور غلط سمجھ کر بھی اس قدر لُطف اندوز ہوتے ہیں کہ اچھے اچھے صحیح سمجھنے والے انھیں جھانکتے رہ جاتے ہیں۔ روزمرّہ بات چیت میں بھی خود کو راقم الحروف کہتے ہیں۔ جیسے ہی ہم ٹاٹ کا پردہ اُٹھا کر "نیا اُفق" کے دفتر میں داخل ہوئے، مُدیرِ موصوف نے ہمارے سلام کے جواب میں دو تین دفعہ اپنا ہاتھ بگلے کی گردن کی طرح موڑ موڑ کر ہمیں دکھایا، جسے ہم نے بدتمیزی سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ مگر جُونہی ہمارا سر چھت سے ٹکرایا، ہماری سمجھ میں آ گیا کہ مُدیر صاحب نے جو ہاتھ کا بگلا بنا کر ہمیں چڑایا تھا تو وہ دراصل

سر گھٹنوں میں دے کر چلنے کا اشارہ تھا، کیونکہ دفتر کی چھت بمشکل پانچ فٹ اونچی ہوگی۔ وہ تو خدا بھلا کرے مرزا کا، اگر وہ ہماری گردن میں لٹک کر ہمیں فی الفور دہرا نہ کر دیتے تو ہمارا کاسۂ سر اوپر چلتے ہوئے پنکھے سے کٹ کا بڑی صفائی سے ترش کر ان کے قدموں میں جا گرا ہوتا۔ اور ہم تو کیا، ہمارے بیمے کی رقم تک خُرد بُرد ہو چکی ہوتی۔

سر اتارنے کے علاوہ پنکھے کا ضمنی مصرف، بقول شخصے، گرم ہوا کو سارے کمرے میں بحصۂ مساوی پھیلانا تھا تاکہ کوئی حصہ محروم نہ رہ جائے۔ جیسے ہی ہم سر اور تن کے نازک سے رشتے کی حفاظت کرتے ہوئے آگے بڑھے، مدیر سہ ماہی "نیا افق" نے اپنا بایاں ہاتھ مصافحہ کے لیے پیش کیا۔ ہم نے بھی اخلاقاً اپنا بایاں نکالا تو چاروں طرف سے کھی کھی کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم نے جھینپ کر جھٹ اسے دائیں جیب میں ٹھونسنے کی کوشش کی۔ پھر یاد نہیں، کونسی جیب میں سے اپنا دایاں کھینچ کر نکالا اور اسے ان کے بائیں سے ملوانے کی کوشش کی۔ کھی کھی۔ کھی کھی کی آوازیں اور تیز ہو گئیں۔ تڑپ کر انھوں نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور دونوں ہاتھوں سے ہماری دائیں کلائی مروڑ کے ہتھیلی کا رُخ اپنی جانب کیا۔ پھر ہماری ہتھیلی کو اپنی ہتھیلی سے دو تین دفعہ خلوص سے رگڑا، جسے ہم ان حالات میں مصافحہ کہہ دیں تو مبالغہ نہ سمجھا جائے۔

دراصل بھول ہماری ہی تھی۔ اس لیے کہ ہر شخص جانتا تھا کہ رنجور صاحب دو سال سے بائیں ہاتھ سے مصافحہ کرنے لگے ہیں، جس کی وجہ یہ تھی کہ گزشتہ بارہ سال سے وہ بائیں ہاتھ میں ایک سوٹ کیس لٹکائے پھرتے تھے، جسے ازراہِ انکسار بریف کیس کہتے تھے۔ اس میں بارہ سال کے سارے کرتوت، یعنی تمام خاص نمبر اور بیگم کے ہاتھ کی بنائی ہوئی گلوریاں بند رہتی تھیں۔ دونوں میں ایک دوسرے کی بُو باس

اس طرح رچ بس گئی تھی کہ مشتری کو "طوائف نمبر" کھول کر دکھاتے تو محسوس ہوتا گویا پاندان کھل گیا اور کبھی ورقِ نقرہ میں لپٹی لکھنوی قوام اور سستی خوشبوؤں کے بھبکے مارتی گلوری کھلا دیتے تو لگتا کہ "طوائف کی آپ بیتی" بلکہ خود اسی کو چبا رہے ہیں۔ بریف کیس اٹھائے پھرنے سے ان کا بایاں کندھا مستقلاً جھک گیا تھا۔ اور اب یہ زنبیل ہاتھ میں نہ ہو تب بھی ان کا بایاں ہاتھ گھٹنے کو چھوتا تھا۔ جب انھیں دنیائے ادب میں LEANING TOWER OF PISA کے لقب سے یاد کیا جانے لگا تو شروع شروع بہت اتراتے پھرے۔ پھر ایک دن مرزا نے تخلیہ میں سمجھایا کہ اشارہ تمھارے سیاسی جھکاؤ کی طرف نہیں ہے تو چونک پڑے "اچھا! یہ بات ہے!" کندھوں کی بارہ سال پرانی کان نکالنے کے لیے مرزا نے یہ ورزش تجویز کی کہ آئندہ بارہ سال تک دوسرے ہاتھ سے اٹھاؤ۔ چنانچہ انھوں نے بریف کیس دائیں ہاتھ میں منتقل کر دیا اور بائیں ہاتھ سے مصافحہ کی عادت ڈالی۔ گلوری بھی اب بائیں کے بجائے دائیں کلّے میں رکھنے لگے تھے۔ یہ اسی زمانے کا ذکر ہے متذکرہ مصافحہ ہو چکا تو پروفیسر نے ہمارا تعارف کرایا کہ آپ سے ملیے۔ آپ ہمارے ساتھ پانچویں جماعت میں دینیات کے پرچے میں نقل کر کے فیل ہوئے تھے۔ اس وقت دو چھتی کے نیچے دس بارہ آدمی بیٹھے ہوں گے۔ حالانکہ کرسیاں دو ہی نظر آ رہی تھیں۔ ایک کی ٹانگیں شرابی جیسی تھیں۔ اس پر میزبان یعنی مدیر "نیا افق" لڑکھڑا رہے تھے۔ دوسری کی پشت اور پایوں کا گھنا ہوا حصّہ چھ چھ انچ کاٹ دیا گیا تھا۔ اس پیڑھی پر مہمانِ خصوصی گنڈلی مارے بیٹھے تھے۔ ان کی ٹھوڑی میز پر اس طرح دھری تھی جیسے میلوں اور قصباتی نمائشوں کے جادو گھر میں مداری کے جھمورے کا کٹا ہوا سر رکھا رہتا ہے۔ سامنے "نیا افق" کی ناقابلِ فروخت کاپیوں کے بنڈل دیوار کے ساتھ بڑے قرینے سے چنے ہوئے تھے۔

ان پر رسالے کے قلمی معاونین بٹھائے گئے تھے۔ یہ نہیں کہ میزبان کو اپنے عزیز مہمانوں کی بے آرامی کا احساس نہ تھا۔ ہر آنے والے کی آؤ بھگت وہ اس طرح کرتے کہ جھپاک سے اپنے نیچے سے روئی کی گدی نکال کر اسے پیش کرتے۔ اور "جی! آپ! نہیں آپ! ارے صاحب! کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں؟" کی پرتکلف تکرار کے بعد اسے واپس اپنی ہی نشست پر رکھ دیتے کہ مؤخر الذکر میں ایک سوراخ تھا، جس میں سے دو فٹ بال بغیر رگڑ کھائے گزر سکتے تھے۔ دروازے کی بائیں جانب تین رنگیلے کنستروں پر دفتر کا سائن بورڈ رکھ کر بچا ہوا صوفہ بنا دیا گیا تھا۔ یہ نشست نقادوں کے لیے مخصوص تھی۔ ہمیں ناقابلِ اشاعت فحش افسانوں کے ایک پلندے پر بٹھایا گیا جن کی گرمی بھی ابھی ٹھیک سے نہیں نکلی تھی۔ ملحقہ کمرے سے ہر عمر کے بچوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ دفتر کی دیواریں دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ یہاں سلیٹ کا رواج نہیں ہے۔ کچھ دیر بعد انہی میں کا ایک بچہ ایلومینیم کا جگ لے کر آیا اور مشروبِ مشرق یعنی خالص پانی کا دَور چلا۔ پانی واقعی نہایت شفاف تھا۔ اتنا شفاف کہ گلاس کا گندا پیندا صاف نظر آرہا تھا۔ ذرا دیر میں سب جھک گئے تو پان پیش کیے گئے، جنھیں اس دفعہ گلوری کہنے میں اس لیے تامل ہے کہ وہ اتنے ننھے منے تھے کہ چھالیا کے دانے ان میں سما نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا چھالیا الگ سے پیش کی گئی۔ ہاں تمباکو وافر مقدار میں تھا۔ جس کا جتنا جی چاہے، کھالے۔

اِن تکلفات کے بعد جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ چار نامور نقادوں نے

پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم۔اے، بی۔ٹی (گولڈ میڈلسٹ) کے مضمون

"موازنہ ٹی۔ایس۔ایلیٹ و شیخ امام بخش ناسخ"

پر مقالے پڑھے۔ یوں تو یہ مضمون پروفیسر موصوف نے پچیس سال پہلے اپنے زمانۂ طالب علمی

میں سپردِ قلم کیا تھا، مگر نقادوں نے اس پر بالکل نئے زاویوں سے روشنی ڈالی تھی۔

آخیر میں مرزا عبدالودود بیگ نے خطبۂ اختتامیہ پڑھ کر حقِ دوستی ادا کیا۔ انھوں نے "بنک آف چاکسو ادبی انعام" کی ایک انقلابی تجویز بھی پیش کی۔ تجویز یہ تھی کہ کچھ قلم کے دھنی ایسے ہیں جو اگر لکھنے سے باز آجائیں تو اُردو پر بڑا احسان ہوگا۔ بنک آف چاکسو پرائز انہی محسنوں کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ اس بات کی پوری چھان بین کرنے کے بعد کہ کس مصنف نے سال بھر واقعی کچھ نہیں لکھا ہے، جج سالانہ پھسلاوے کا اعلان کریں گے۔ انعام یافتہ مصنف اگر پرورشِ لوح و قلم سے سیدھی طرح باز آجائے تو "لائف پنشن" کا حقدار ہوگا جو بشرطِ نیک چلنی اسے ماہ بماہ ملتی رہے گی۔ اگر بروقت موت واقع ہو جائے تو بیوہ کے لیے معقول وظیفہ بھی مقرر کیا جائے گا بشرطیکہ وہ تمام غیر مطبوعہ تخلیقات جو مرحوم چوری چھپے کرتے رہے، ان کے ساتھ ہی دفن کر دی جائیں۔

اس پر ہم نے زور زور سے تالیاں اور پاس والا کنستر بجایا۔ اور اللہ جانے، کب تک بجاتے رہتے اگر مرزا یکایک یہ اعلان نہ کر دیتے کہ اس سلسلہ کے پہلے انعام کا مستحق سارے پاکستان میں ہم (یعنی راقم السطور) سے زیادہ اور کوئی نہیں!

ہماری یہ دُرگت ہفتے میں چار پانچ دفعہ ضرور بنتی تھی۔ اس لیے کہ ہفتے میں چار پانچ دفعہ پروفیسر کے اعزاز میں کہیں نہ کہیں استقبالیہ ہوتا تھا، جہاں پہلی صف میں تالی بجاتے ہوئے فوٹو کھنچوانے کے فرائض ہمارے ذمّے ہوتے تھے۔ (مرزا کہتے ہیں کہ بڑے آدمیوں کی تقریر کے بعد تمھاری تالی بالکل الگ سنائی دیتی ہے) دفتر میں اپنی مصروفیت کے بارے میں دن بھر باتیں کر کر کے پروفیسر خود کو بُری طرح تھکا

لیتے تھے۔ ایک عمر نکبت و ناکامی کی زندگی بسر کرنے کے بعد اب وہ جہاں نظر آتے تھے، گیندے کے ہار پہنے، افتتاحی فیتہ کاٹتے نظر آتے۔ یہاں تک سننے میں آیا کہ ان تمام ضیافتوں کا خرچ پروفیسر خود اُٹھاتے ہیں۔ صرف ایک استقبالیہ کا بار اُنھوں نے نہیں اٹھایا۔ اس کا مفصل حال ہم آپ کو سنا چکے ہیں۔ سات آٹھ مہینے تک تو اُن کے تقرر کی خوشی میں دعوتیں ہوتی رہیں۔ اور اس کے بعد غالباً اس خوشی میں کہ وہ ابھی تک برخاست نہیں ہوئے تھے۔ ہو یہ رہا تھا کہ سستے اور فلمی رسالے بینک کے اشتہار کی گھات میں رہتے اور موقع پاتے ہی (جو پروفیسر مستقل فراہم کرتے رہتے تھے) نیا تلادار کر ہوا نے یعنی پروفیسر کا "موازنہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ و شیخ امام بخش ناسخ" جس میں اُنھوں نے ممولے کو شہباز سے لڑایا تھا، من و عن چھاپ دیتے۔ پروفیسر غریب اب "موازنہ" کو جتنا دبانا اور چھپانا چاہتے، رسالے اُتنا ہی اسے اُچھالتے۔ گویا مصنف کو اُسی کی تحریر سے بلیک میل کر رہے تھے۔ پروفیسر کو شہر کے ایک ایک بُک اسٹال سے ایسے شماروں کی تمام کاپیاں بینک کے خرچ پر خرید کر جلانی پڑتیں تاکہ لوگ "موازنہ" نہ پڑھ پائیں۔ اب وہ اپنے گڑے مُردے کو اُکھڑوا کر رُوح پھنکواتے پھنکواتے عاجز آ چکے تھے۔ مجبوراً "موازنہ" کی جگہ بینک آف چاکسو کے بارہ اشتہار بُک کر کے ایڈیٹر کے منہ پر ایک سال کے لیے طلائی قفل لگا دیتے۔

پروفیسر کو اُن کے ماضی کے ملبے سے کھینچ کر نکالنے کا سہرا مرزا کے سر رہے۔ اُن کی ذہنی آبادکاری میں جو دُشواریاں پیش آئیں، اُن کا احاطہ اس مختصر سے مضمون میں کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ پروفیسر کو نیک و بد کی تمیز ضرور تھی۔ اور اگر قوّتِ باصرہ فرانس کی شمپین سے متاثر نہ ہو تو سیاہ و سفید میں بھی امتیاز کر سکتے تھے بشرطیکہ ان

رنگوں کا تعلق نسوانی جلد سے ہو۔ مگر چھوٹے بڑے بیوپاری کی پہچان؟ یہ سوال انھیں ہمیشہ نصاب سے باہر معلوم ہوتا تھا۔ کسی کا "بنک بیلنس" ماتھے پر تو لکھا ہوتا نہیں۔ چنانچہ ایک دو مہینے تک یہ رویّہ رہا کہ اگر کوئی شخص میلا مسلا کرتا پاجامہ پہنے، خط بڑھائے انگوٹھے اور کلمے کی اُنگلی سے باچھوں کی پیک پونچھتا بغیر کارڈ بھیجے کمرے میں مُنہ اُٹھائے چلا آتا تو اسے دھکّے دے کر تو نہ نکالتے مگر اس طرح پیش آتے کہ اس زحمت کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ غلط اُردو بولنے والوں کو چائے تک کے لیے نہ ٹوکتے لیکن جب پہلی ہی بورڈ میٹنگ میں انہی میں کے چار اشخاص کو ڈائرکٹروں کی سُرخ مخملی کُرسیوں پر متمکّن دیکھا (جن سے اپنے کمرے میں اُنھوں نے ہاتھ بھی نہیں ملایا تھا تاکہ بعد میں رگڑ رگڑ کر نہ دھونا پڑے) تو اُن کی آنکھیں کُھل گئیں اور چار ہندسے والی تنخواہ خطرے میں نظر آنے لگی۔ پھر تو دل میں ایسا ہول بیٹھا کہ سڑک پر کوئی بھی مَیلے کُچیلے کپڑوں میں نظر آجاتا تو فوراً سلام کر لیتے تھے۔

پروفیسر کی بوکھلاہٹ سے ان کی عظیم ذمّہ داریوں کا اندازہ ہوتا تھا۔ اور ان عظیم صلاحیتوں کا بھی جن کے بغیر وہ بخوبی گزارہ کر رہے تھے۔ حواس مختل، زبان کھچڑی، لب و لہجہ اُکھڑا اُکھڑا۔ اور بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ غور تو فرمایئے۔ ابھی مُلتان کے سوداگرِ چرم و پشم کے ساتھ اِس پر شرط بدی جا رہی ہے کہ حاجیوں کے پہلے جہاز کی واپسی پر تیزابی سونے کا بھاؤ کتنا گرے گا۔ اور اب FANNY HILL کے دورانِ خون کو تیز کرنے والے اقتباسات میز کی دراز سے نکال کر سُنائے جانے لگے۔ پانچ منٹ پہلے ایک اشتہار کے طلب گار سے ہاتھا پائی ہوتے ہوتے رہ گئی کہ اُس نے منہ بھر کر یوں کہہ دیا تھا کہ آپ ہر پھر کے اندھوں ہی کو ریوڑی بانٹتے ہیں۔ اور اب یہ مسئلہ

زیرِ بحث ہے کہ پانی کے دریاؤں* سے جو نقصان مشرقی پاکستان میں ہُوا ہے اُس سے بنکوں کی شرحِ سُود اور اُردُو رُباعی پر کیا اثر پڑے گا۔ ایک رِسیور یہ کہہ کر رکھ دیا کہ "ذرا ایک منٹ توقف فرمائیے۔ میں ہانگ کانگ ڈالر کا بھاؤ ابھی معلوم کر کے بتاتا ہُوں"۔ دُوسرے فون پر یکبارگی اپنا گیئر بدل کر کہنے لگے "واہ! واہ! کیا پھڑکتا ہُوا مصرع نکالا ہے! ذرا پانچ منٹ بعد دُوسرا بھی مرحمت فرمائیے گا"۔ مگر مصرعِ ثانی والی گھنٹی پانچ کے بجائے دو منٹ بعد ہی بجنے لگی "ہیلو! ہیلو! واللہ! کیا تیور ہیں! بالکل مومنؔ کا سا انداز ہے! ہائیں؟ کیا کہا؟ مومنؔ ہی کا شعر ہے!! لاحول ولاقوۃ! میں تو سمجھا آپ کا ہے! مگر مومنؔ کی بھی کیا بات ہے! کبھی کبھی ظالم بالکل آپ ہی کے انداز میں شعر کہہ جاتا ہے!"

کاروباری دنیا میں بالعموم شعر و شاعری کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مگر پروفیسر نے نکال لی تھی۔ مہینوں تک یہ حال رہا کہ ہر دو جملوں کے بعد ایک شعر جھاڑ دیتے تھے۔ اور یہ جملے بھی دراصل شعر ہی کی تمہید یا تعریف میں ہوتے تھے۔ ورنہ انھیں چھُوٹ دے دی جاتی تو بنکاری کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کا دو ٹوک فیصلہ دیوانِ حافظؔ سے فال نکال کر سکتے تھے۔ مرزا ایک دفعہ ان سے ملنے گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ فارمیکا کی ہلال نما میز کے گرد خوش گلو و خوش خوراک شعراء اشیائے خوردنی کے ساتھ انصاف فرما رہے ہیں۔ اور بنک میں دِن دہاڑے مشاعرہ لُوٹ رہے ہیں۔ ٹیلی فون کا رسیور اُتار کر شاعر کے سامنے رکھ دیا گیا ہے تاکہ مشاعرے کی کارروائی صیغے تک "ریلے" کی جا سکے جو چار میل دُور

---

* اس زمانے میں قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" کا نام لوگوں کی زبان پر اس قدر چڑھا ہُوا تھا کہ جب بھی اصلی دریا کا ذکر ہوتا تو پروفیسر موصوف ابہام سے بچنے کے لیے پانی کا دریا کہتے تھے۔

صدر ہیں اپنی کتابوں کی دکان میں ڈیڑھ گھنٹے سے بائیں ہاتھ میں فون لیے بیٹھے ہیں اور دائیں ہاتھ سے گاہکوں کو اس وقت کتابیں خریدنے سے منع کر رہے ہیں۔ شاعر کو کبھی کبھی ریسیور کان سے لگا کر سننے کی داد سنوا دی جاتی ہے اور وہ اٹھ اٹھ کر لکھنوی انداز سے فون کو آداب بجا لاتا ہے۔

مرزا غریب تو کسی کام سے گئے تھے۔ لیکن دروازے کی درز میں سے جھانک کر یہ نقشہ دیکھا تو سرکاری کام کو ان کی تفریح میں حارج پاکر اُلٹے پاؤں لوٹ آئے۔ شعر و شاعری سے مرزا کی طبعِ ناموزوں یوں بھی ابا کرتی ہے۔ اور مشاعروں سے تو وہ کوسوں دُور بھاگتے ہیں۔ خصوصاً بڑے مشاعروں سے۔ کہتے ہیں "صاحب! جو شعر بیک وقت پانچ چھ ہزار آدمیوں کی سمجھ میں آجائے، وہ شعر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس میں ضرور کچھ نہ کچھ کھوٹ نکلے گا۔" مرزا نے جب دیکھا کہ پروفیسر کو نثر میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں بڑی دُشواری ہونے لگی ہے تو سمجھانے بیٹھ گئے "پروفیسر! یہ ساہوکارہ سنسار ہے۔ صحیح اردو سے گجراتی سیٹھ بے حد رُعب کھاتا ہے، مگر سودا بگڑ جاتا ہے۔ کسی نے مجھے بتایا کہ دو سیٹھ مختلف اوقات میں تمہارے بنک میں اکاؤنٹ کھولنے آئے۔ لیکن ایک میمن کو تو تمہاری سکریٹری نے گھسنے نہیں دیا۔ اور دُوسرے چنیوٹی بیوپاری نے، جو رقم جمع کرانے آیا تھا، تمہیں بنک میں دیکھ کر فوراً ارادہ بدل دیا اور اپنی جمع جتھا ٹوپی میں چھپا کے کہنے لگا کہ میں تو دراصل اوورڈرافٹ لینے آیا تھا۔ کمال یہ کہ تم نے واقعی اسے اوورڈرافٹ دلوا دیا، جس سے اُس نے اُسی وقت دُوسرے بنک میں جاکر اکاؤنٹ کھول دیا اور یوں اہلِ درد کو پنساریوں نے لوٹ لیا۔"

مرزا انھیں شعر سُنانے سے باز رکھ سکتے تھے، لیکن شعر سننے پر کیسے پابندی لگاتی

جا سکتی تھی۔ پروفیسر سامنے بیٹھے ہوئے شاعر کا مصرع اُٹھانے سے انکار کر سکتے تھے، لیکن اُن کا منہ کیسے بند کرتے جو فرصتِ گفتگو غنیمت جان کر فون پر ہی خُون تھوکنے لگتے تھے۔ ایک دن پروفیسر بُری طرح بوکھلائے ہُوئے تھے، کیونکہ آدھ گھنٹے بعد بورڈ آف ڈائرکٹرز کا اجلاس تھا، جس میں بنک کا پبلسٹی بجٹ برائے تزئینِ دگالی گلوج پیش ہونے والا تھا۔ ان کی صُورت ایسی ہو رہی تھی جیسی اشتہاروں میں اُن لوگوں کی ہوتی ہے جن کو "ہارلکس" کی ضرورت ہوتی ہے۔ میز پر کاغذات کا انبار لگا ہُوا تھا۔ کمرے کے باہر لال بتی روشن تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ آج وہ واہی تباہی آدمیوں یعنی اپنے خاص دوستوں سے ملاقات نہیں کریں گے۔

اِتنے میں سفید ٹیلی فون★ کی میٹھی میٹھی آواز والی گھنٹی بجی اور دُوسرے سرے سے گودام کیپر کی اسامی کے ایک اُمّید وار حضرتِ مدہوش مادھوپُوری نے اپنے تخلّص جیسے ترنم میں اپنی نو تصنیف مسدّس سُنانی شرُوع کی۔ ہرچند کہ یہ توڑ کا وقت تھا اور پروفیسر کو سگرٹ کی راکھ جھاڑنے تک کی فُرصت نہ تھی، لیکن مسدّس کے ابتدائی بند انھی کی مدح میں تھے اور اللہ غنی! اس میں اِس قدر غلُو سے کام لیا گیا تھا کہ فون بند کرنے کو کسی طرح جی نہ چاہا۔ خُدا جانے کب کا لیا دِیا آڑے آگیا کہ بیس منٹ بعد فون خود بخود خراب ہوگیا اور پروفیسر اپنی نیلی 'بو' ٹھیک کرتے ہُوئے بورڈ رُوم کی طرف بھاگے۔ اجلاس ایک

★ سفید ٹیلی فون ——— یہ ان کا پرائیوٹ وی۔ آئی۔ پی نمبر تھا۔ جو ڈائرکٹری میں درج نہیں ہوتا تھا اور جو صرف انتہائی اہم یا انتہائی بیہودہ گفتگو کے لیے مخصُوص تھا۔ درمیانہ موضُوعات سے معمُولی نیلی فون بر نمٹ لیتے تھے۔ اندرونِ دفتر بُرا بھلا کہنے کے لیے سُرمئی اور سُننے کے لیے سیاہ آلہ استعمال کرتے تھے۔

نج نجے ختم ہو گیا، مگر فون بدستور مثل سابق خراب رہا۔ پروفیسر نے قصداً اُسے ٹھیک نہیں کرایا، اس لیے کہ وہ اپنی سکریٹری کو یکسوئی کے ساتھ میٹنگ کی کارروائی لکھوانا چاہتے تھے۔ ٹیلیفون آپریٹر نے بھی فون ملانے بند کر دیے اور چند گھنٹے عافیت سے گزرتے وہ کارروائی لکھوا ہی رہے تھے کہ یکایک سفید فون کی گھنٹی آپ ہی آپ بجنے لگی۔ وہ اُچھل کر اپنی سکریٹری کی گود میں جا پڑے اور دیر تک وہیں بے سُدھ پڑے رہے۔ اسی عالم میں اس کے چٹکی لے کر دیکھا کہ جاگ رہا ہُوں یا خواب میں ہُوں۔ جب اُس نے پٹاخ سے گالی دی تو انھیں یقین آیا کہ خواب نہیں ہے! ریسیور اُٹھا کر بولے "ہیلو! قاضی عبدل گدّس ہیئر! ہیلو! ہیلو! قاضی دِس سائیڈ!" اُدھر سے آواز آئی "جی! بجا فرمایا! مگر میں تو مدہوش مادھو پوری عرض کر رہا ہوں۔ واللہ! صبح دس بجے سے آپ کا فون دُرست کرانے میں لگا ہُوا ہُوں۔ خُدا جھوٹ نہ بلوائے۔ دس جگہ شکایت نوٹ کرائی ہوگی۔ آخر جھک مار کر خود ٹیلی فون ایکسچینج گیا اور ایک ایک کی خبر لے ڈالی۔ جب کہیں جا کر پانچ بجے آپ کی گھنٹی بجی ہے۔ جی! تو عرض کیا ہے ——"

اور وہ چھ بجے تک عرض کرتے رہے!

کوئی دِن خالی جاتا ہوگا کہ خفّت و آشفتہ خاطری کی کوئی نئی صُورت پیدا نہ ہو۔ ایک دِن (غالباً پیر کا دِن تھا، جسے مرزا یوم سیاہ کہتے ہیں۔ اکثر پیش گوئی کرتے ہیں کہ دیکھ لینا، قیامت پیر ہی کے دِن آئے گی) بنک میں اُداس بیٹھے اپنے مخصوص انداز سے —— یعنی پیالی ہونٹوں سے لگاتے وقت چھنگلیا اُٹھائے ہُوئے —— فرنچ کافی پی رہے تھے۔ حسبِ عادت زور سے آنکھیں سکیڑ رکھی تھیں، حالانکہ اس وقت ردِّ تاباں کے گرد سگرٹ کے دُھوئیں کا ہالہ نہیں تھا۔ کافی کے ہر گھونٹ کے بعد بائیں

ہاتھ سے اس خیالی دھوئیں کو ہٹاتے جاتے تھے تاکہ مچ مچی آنکھوں میں نہ گھسنے پائے۔ اتنے میں رسالہ "مینا بازار" کی ایڈیٹر آنکلیں۔ پروفیسر نے کہا کہ آپ پچیس سال سے بالکل ویسی کی ویسی ہی ہیں! بہت خوش ہوئیں۔ حالانکہ پروفیسر کا مطلب درحاصل یہ تھا کہ جیسی بدصورت آپ پچیس سال پہلے تھیں، ویسی ہی اب بھی ہیں۔ محترمہ نے "مینا بازار" کا تازہ شمارہ پیش کیا۔ پروفیسر سرورق پر کسی ایکٹرس کے بجائے اپنی تصویر دیکھ کر بھونچکے رہ گئے۔ سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ تصویر بالکل ان سے ملتی تھی بہتر نہ تھی۔

"مینا بازار" میں اشتہار نکلنا تھا کہ تمام زنانہ رسالوں نے یلغار کر دی اور پروفیسر سوچتے ہی رہ گئے

کھاؤں کدھر کی چوٹ، بچاؤں کدھر کی چوٹ

مدیر "آنچل" سے جو تاریخی مچیٹا ہوا، اُس کے مکالمے پاک بوہیمین کافی ہاؤس کے بیروں تک کو ازبر ہیں۔ پروفیسر کو مدیر موصوف سے پہلی نظر میں نفرت ہو گئی۔ وہ تو خیریت گزری، ورنہ پروفیسر کا سینہ اگر ۴۲ انچ کے بجائے ۴۳ انچ ہوتا تو پہلی ہی ملاقات میں اُن کا لتھو* بنا ڈالتے۔ یہ رسالہ پینتیس ۳۵ سال سے اُنہی خواتین کی خدمت کیے جا رہا تھا جو اُس وقت پینتیس ۳۵ سال کی تھیں جب رسالے کا پہلا شمارہ نکلا تھا۔ قصّہ کہانی کی اوٹ میں یہی شریف بیبیاں اپنی ہم عمر بیبیوں کو مزید شریف رہنے کی تلقین کرتی رہتی تھیں۔ رسالہ ایسے عریاں افسانوں سے یکسر پاک تھا جن سے ہر شخص بقدر

* لتھو بنانا ــــــ ایسی مار مارنا کہ اپنے بھی صورت نہ پہچان سکیں، جیسا کہ اُردو لتھو کی چھپائی میں ہوتا ہے۔

بد ذوقی محظوظ ہو سکے۔ جنسی کہانیوں کے بجائے رسالے میں کنواریوں بالیوں کو پلنگ کی کوری چادر پر کروشیے سے "خوش آمدید" کاڑھنے کی ترکیبیں سکھائی جاتی تھیں۔ ادبی مزاج اتنا بدل چکا تھا کہ جو شاعر ۲۵ برس پہلے دُنیا کو مایا کا جال سمجھتے تھے، وہ اب اسے سرمایہ کا جال کہنے لگے تھے۔ لیکن "آنچل" کے لکھنے والے آج بھی عورتوں کو مستورات کہتے اور ماحول پر لاحول بھیجتے ہیں۔ نئی تراش کی چولی میں ان بزرگوں کو قربِ قیامت کے آثار دکھلائی دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے مرزا عبدالودود بیگ تو اُلٹی تمنا کرتے ہیں کہ صاحب! قُربِ قیامت کی سچ مچ یہی نشانیاں ہیں تو پھر جلدی سے سُورج سوا نیزے پہ آجائے کہ زندگانی کا کچھ بھروسا نہیں۔ اور صاحب!

زندگانی گر رہی تو نوجوانی پھر کہاں

موصوف نے آتے ہی فرمائش کی کہ "موازنہ" کی ٹکر کی کوئی چیز "آنچل" کے لیے عطا ہو۔ پروفیسر نے انھیں مطلع کیا کہ عدیم الفرصتی کے سبب وہ گزشتہ پچیس سال سے کچھ نہیں لکھ سکے۔ سلام روستائی کے بعد غرضِ خاص کا اظہار ہوا: اِشتہار چاہیے۔ پروفیسر نے عُذر کیا، سالانہ بجٹ ختم ہو چکا ہے۔ فرمایا "چلیے، کوئی مضائقہ نہیں۔ بنک کے رجسٹروں اور فارموں کا سالانہ آرڈر ہی آنچل پریس کو عنایت فرمائیے۔" پروفیسر نے جواب دیا "مگر سات لاکھ روپے کی اسٹیشنری آپ ایک ٹریڈل مشین پر دس برس میں بھی نہیں چھاپ سکیں گے۔" ارشاد ہوا "تو پھر بنک سے پچاس ہزار کا 'کلین اوور ڈرافٹ' ہی دلوا دیجیے۔"

پروفیسر کے صبر کا مختصر سا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ دفتری ضبط و احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے فرمایا "آپ کے مطالبوں کی ترتیب بالکل اُلٹی ہے۔ بخدا! بالکل اُلٹی! چاہیے

تو یہ تھا کہ پہلے آپ پچاس ہزار قرض مانگتے۔ اس کے بعد اسٹیشنری کے آرڈر کی فرمائش کرتے۔ یہ بھی نہیں ملتا تو اشتہار مانگتے۔ پھر بھی میں انکار کرتا تو مضمون طلب کرتے۔ پھر میری ہمت نہیں ہوتی کہ انکار کرتا۔ شرما شرمی مضمون تو دے ہی دیتا۔"

بولے "ارے صاحب! یہی تو مجھے بھی اندیشہ تھا!"

بچوں کے رسالے ہمیشہ سے نگاہِ التفات سے محروم تھے۔ آخر یہ کفر اس طرح ٹوٹا کہ رسالہ "بازیچۂ اطفال" نے ایک ضخیم "اشتہار نمبر" نکالنے کا اعلان کیا اور اس کے بعد یہ رسالہ بھی بینک کے اشتہارات سے نوازا جانے لگا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ "اشتہار نمبر" پر ریجھ گئے یا اس کی مدیرہ آنسہ سمنتا فرزدق کی تیغِ ابرو سے برضا و رغبت ڈھیر ہوتے۔ سفید شلوار، سفید قمیض، سفید دوپٹہ، سیدھی مانگ، ننگے ہاتھ، ننگے کان۔ ہمیں تو وہ کسی طرف سے ایسی نہیں لگتی تھیں کہ آدمی کے پانچوں حواس پر ڈاکہ ڈال سکیں یا پہلی ہی ملاقات میں پروفیسر کے قلعۂ ایمان کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔ لیکن یاد رہے کہ پروفیسر کنوارے تھے۔ چالیس سال کے تھے۔ اور حالیہ مردم شماری میں اپنا شمار مردوں میں کروا چکے تھے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارے ہیرو نے آج تک کوئی عورت ایسی نہیں دیکھی، جس کو وہ ناپسند کر سکے۔ کنارے کو ترسا ہوا مانجھی ہر اُتھلی کھاڑی میں لنگر ڈال دیتا ہے۔ آنسہ سمنتا نے آتے ہی مژدہ سنایا کہ انھوں نے "موازنہ" کو بچوں کے لیے آسان اردو میں منتقل کیا ہے۔ ہاں عنوان میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی ہے۔ یعنی شیخ امام بخش ناسخ کے بجائے مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کو بھڑا دیا ہے۔ البتہ اشعار وہی رہنے دیے ہیں تاکہ مضمون کی اصل شان برقرار رہے۔ اب موصوفہ اس مقالہ کے ساتھ مصنف سے انٹرویو کی روداد مع تازہ تصویر شائع کرنا چاہتی تھیں

اور اِس سلسلے میں پروفیسر کو اپنے ہاں سنیچر کو چائے پر مدعو کرنے آئی تھیں۔ پروفیسر نے بہتیرا عذر کیا کہ سنیچر کی شام کو مجھے بہت کام ہے۔ تین کاک ٹیل پارٹیوں میں یکے بعد دیگرے شرکت کرنی ہے۔ لیکن وہ نہ مانیں۔ پیہم انکار سے اُن کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

پروفیسر کو عورت کے آنسوؤں کی ذرا سہار نہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ عورت کی کسی چیز کی سہار نہیں!

چنانچہ طے یہ پایا کہ پروفیسر تینوں کاک ٹیل پارٹیاں لشتم پشتم بھگتا کر ساڑھے سات بجے تک اُن کے گھر پہنچ جائیں گے۔

پروفیسر کا اپنا بیان تھا کہ اُنھوں نے تینوں کاک ٹیل پارٹیوں میں اپنے "پروٹوکول" فرائض کی انجام دہی میں "اپنی طرف سے تو کوتاہی میں کوئی کمی نہیں کی"! مرزا کے کندھے پر اپنا سارا بوجھ ڈالے، وہ جم خانہ سے خمخانہ بکف و جمخانہ بدوش آنسہ سمنتا کے ہاں چائے نوش فرمانے پہنچے تو دس کا عمل ہوگا۔ جس وقت وہ اپنی تیس ہاتھ لمبی کیڈلک سے اُترے ہیں تو مرزا کے بیان کے مطابق ان کا دایاں پاؤں اُس جگہ پڑ رہا تھا جہاں بایاں پڑنا چاہیے تھا۔ اور جن حروف کی آوازیں ہماشما کے منہ سے نکلتی ہیں، وہ ان کی ناک سے بآسانی نکل رہی تھیں۔ گیلری سے گزرتے وقت اُنھوں نے ایک گرتی ہوئی دیوار کو اپنی پیٹھ سے سہارا دینے کی کوشش بھی کی۔ پھر انٹرویو شروع ہوا اور ٹیپ ریکارڈر چلنے لگا۔

مس سمنتا نے چند رسمی سوالات کے بعد پوچھا کہ آپ ابھی تک کنوارے ہیں۔ کس قسم کی بیوی اپنے لیے پسند کریں گے؟ پروفیسر نے جھومتے ہوئے فرمایا کہ مجھے روشن خیال بیوی بہت پسند ہے ——— بشرطیکہ وہ کسی دوسرے کی ہو! موصوفہ نے پلّو منہ میں ٹھونستے ہوئے سنِ پیدائش پوچھا تو پروفیسر نے ۱۹۴۲ بتایا اور وضاحتہً

A.D. (بعد مسیح) بھی کہا تاکہ سُننے والے کو مُغالطہ نہ ہو۔ موصُوفہ نے چندرا کر کہا، مگر آپ تو شکل سے صرف چالیس سال کے لگتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ پروفیسر نے جواب دیا کہ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں چالیس ہی سال کا ہُوں! پھر دُوسری وجہ کی تشریح و تشہیر کرتے ہوئے فرمایا کہ ناول نگار جارج مور سے کسی صحافی نے دریافت کیا کہ آپ اَسّی سال کی عُمر میں بھی سُرخ و سپید رکھّے ہیں، اس کا کیا راز ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے شراب، سگرٹ اور سیکس، کو قطعی ہاتھ نہیں لگایا ——— تاوقتیکہ میں گیارہ سال کا نہ ہو گیا!

ہمارے یک طرفہ بیان سے یہ نہ سمجھا جائے کہ پروفیسر ترنگ میں اپنی ہی خوبیاں ذہن نشین کراتے رہے۔ ان کی نظر دُوسروں پر بھی تھی۔ مثلاً اُنھوں نے موصُوفہ کی توجّہ ایک ایسی خوبی کی طرف مبذول کرائی، جس سے وُہ بالکل بے خبر معلوم ہوتی تھیں۔ "آپ کی پسند کا سوال آیا تو پروفیسر نے:

موتیا، مصحفی، سنیچر کی شام، ہنری ملر، مہاوٹ، دال بھرے گرم پراٹھے
ریشمی دولائی، نیگرو دوشیزہ
کا ذکر کرتے کرتے

"بھئی! آپ کا دایاں کان سچ مچ بہت خوب صورت ہے!"

ایسے سُوکھے سے مُنہ سے کہا کہ موصُوفہ کے بائیں کان کو یقین نہیں آیا کہ ان کا دایاں کان کیا سُن گیا۔ مرزا کہتے ہیں کہ سُمنا فرزوق کے دونوں کانوں میں بظاہر کوئی فرق نہیں تھا، لیکن پروفیسر نے دائیں کی تخصیص غالباً ازراہِ احتیاط کی تھی، اس لیے کہ اس وقت اُنھیں صرف دایاں کان ہی نظر آ رہا تھا۔ بہر حال یہ جُملہ بھی ریکارڈ ہو گیا اور اس کے ساتھ وُہ

ہچکیاں بھی جو ہر لفظ کے بعد ان کی سوانح عمری میں "فل اسٹاپ" لگا رہی تھیں۔ پروفیسر نے جب تیسری دفعہ یہ کلماتِ تحسین ممدوحہ کے کان میں انڈیلے تو انھوں نے ٹیپ ریکارڈر آہستہ سے "سوچ آف" کر دیا۔ اور سفید دوپٹہ اپنے سر پر اس طرح لپیٹ لیا جیسے پرہیزگار بیبیاں نماز پڑھتے وقت لپیٹ لیتی ہیں۔ جیسے ہی وہ چائے لینے اندر گئیں تو مرزا کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگے

"ان کا دایاں واقعی بہت خوبصورت ہے"۔

بیچ میں مرزا نے دو تین دفعہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اُٹھنے کا اشارہ کیا تو پروفیسر نے اس طرح ہاتھ گھمایا جیسے چکّی پیس رہے ہوں۔ اِس کا مطلب تھا کہ وہ وہیں مرزا کا بھتو بنا دیں گے۔

وُہ میز پر ٹرے رکھنے کے لیے جھکیں تو دوپٹہ ڈھلک کر گلے میں آگیا اور پروفیسر نے چپکے سے دائیں کان میں وُہی جملہ دُہرا دیا۔ اب کی دفعہ جو موصوفہ نے ڈھاٹا باندھا تو آخر تک نہیں کھولا۔ خدا خدا کر کے پونے بارہ بجے انٹرویو اپنے اختتام کو اِس طرح پہنچا کہ پروفیسر کو بیچ جملے کے نیند آگئی۔ مرزا نے مُنہ پر پانی کے چھپکے دے کر جگایا۔ موصُوفہ چند منٹ بعد موصُوف کو کار میں سوار کرانے باہر تشریف لائیں۔ وقتِ رُخصت آداب بجا لانے کے لیے انھوں نے اپنی صُراحی دار گردن خم کی تو دوپٹہ کا اینڈوا پھر سینے پر آرہا اور پروفیسر نے جواب میں انگشتِ شہادت اُٹھاتے ہُوئے فرمایا

"آداب! اور بایاں بھی ——"

اور وُہ جھینپ کر دائیں بائیں کانوں پر ہاتھ رکھّے اندر بھاگ گئیں۔

صُبح مرزا نے پروفیسر کو ان کے اَقوال و اَفعالِ شبینہ سے آگاہی بخشی تو

انھیں یقین نہیں آیا کہ ایسی نالائقی کا صدور اُن کی ذات سے ہو سکتا ہے۔ اُسی وقت جاکر اُس نیک بی بی سے مُعافی مانگنے پر بضد تھے۔ مرزا نے بمشکل تمام باز رکھا۔ اُس رات انھیں مارے ندامت کے نیند نہیں آئی۔ نیند تو دُوسری رات بھی نہیں آئی، مگر کسی اور وجہ سے۔ وہ وجہ یہ تھی کہ موصُوفہ خود بنک میں تشریف لائیں اور کہنے لگیں کہ ایک پُرزے کی خرابی کی وجہ سے اس رات انٹرویو ٹھیک سے ریکارڈ نہیں ہُوا۔ لہٰذا دوبارہ چلئے، پر زحمت فرمائیں۔

اور ہاں! آج وُہ (دونوں) کانوں میں موتیا کی کلیوں کی بالیاں پہنے ہُوئے تھیں۔ کان کی لَو نہ جانے کتنی بار گلابی ہُوئی ہوگی کہ جب وہ رُخصت ہُوئیں تو ایک ایک کلی کِھل چکی تھی۔

۱۹۶۵ء ـــــ ۱۹۶۸ء

ہوئے مر کے ہم جو رسوا

اب تو معمول سا بن گیا ہے کہ کہیں تعزیت یا تجہیز و تکفین میں شریک ہونا پڑے تو مرزا کو ضرور ساتھ لے لیتا ہوں۔ ایسے موقعوں پر ہر شخص اظہارِ ہمدردی کے طور پر کچھ نہ کچھ ضرور کہتا ہے۔ قطعۂ تاریخِ وفات ہی سہی۔ مگر مجھے نہ جانے کیوں چُپ لگ جاتی ہے جس سے بعض اوقات نہ صرف پس ماندگان کو بلکہ خود مجھے بھی بڑا دکھ ہوتا ہے۔ لیکن مرزا نے چپ رہنا سیکھا ہی نہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ صحیح بات کو غلط موقع پر بے دغدغہ کہنے کی جو خداداد صلاحیت اُنھیں ودیعت ہوئی ہے وہ کچھ ایسی ہی تقریبوں میں گل کھلاتی ہے۔ وہ گھپ اندھیرے میں سرِ رہگزر چراغ نہیں جلاتے، پھلجھڑی چھوڑتے ہیں، جس سے بس ان کا اپنا چہرہ رات کے سیاہ فریم میں جگ مگ جگ مگ کرنے لگتا ہے۔ اور پھلجھڑی کا لفظ تو یونہی مروّت میں قلم سے نکل گیا، ورنہ ہوتا یہ ہے کہ

جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کر اُٹھے

اس کے باوصف، وہ خدا کے اُن حاضر و ناظر بندوں میں سے ہیں جو محلّے کی ہر چھوٹی بڑی تقریب میں، شادی ہو یا غمی، موجود ہوتے ہیں۔ بالخصوص دعوتوں میں سب سے پہلے پہنچتے اور سب کے بعد اُٹھتے ہیں۔ اس اندازِ نشست و برخاست میں ایک کُھلا فائدہ یہ دیکھا کہ وہ باری باری سب کی غیبت کر ڈالتے ہیں۔ ان کی کوئی نہیں کر پاتا۔

چنانچہ اس سنیچر کی شام کو بھی میوہ شاہ قبرستان میں وہ میرے ساتھ تھے۔ سورج اس شہرِ خموشاں کو جسے ہزاروں بندگانِ خُدا نے مر مر کے بسایا تھا، لال انگارہ سی آنکھ سے دیکھتا دیکھتا انگریزوں کے اقبال کی طرح غرُوب ہو رہا تھا۔ سامنے بیری کے درخت کے نیچے ایک ڈھانچہ قبر بدر پڑا تھا۔ چاروں طرف موت کی عمل داری تھی اور سارا قبرستان ایسا اُداس اور اُجاڑ تھا جیسے کسی بڑے شہر کا بازار اتوار کو۔ سبھی رنجیدہ تھے۔ (بقول مرزا، دفن کے وقت میّت کے علاوہ سب رنجیدہ ہوتے ہیں۔) مگر مرزا سب سے الگ تھلگ ایک پُرانے کتبے پر نظریں گاڑے مسکرا رہے تھے۔ چند لمحوں بعد میرے پاس آئے اور میری پسلیوں میں اپنی کُہنی سے آنکس لگاتے ہُوئے اس کتبے تک لے گئے، جس پر منجملہ تاریخ پیدائش و پنشن، مولد و مسکن، ولدیت و عہدہ (اعزازی مجسٹریٹ درجۂ سوم) آسُودۂ لحد کی تمام ڈگریاں مع ڈویژن اور یونیورسٹی کے نام کے کندہ تھیں اور آخر میں، نہایت جلی حروف میں، مُنہ پھیر کر جانے والے کو بذریعہ قطعہ بشارت دی گئی تھی کہ اللہ نے چاہا تو بہت جلد اس کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے۔

میں نے مرزا سے کہا "یہ لوحِ مزار ہے یا ملازمت کی درخواست؟ بھلا ڈگریاں، عہدہ اور ولدیت وغیرہ لکھنے کا کیا تک تھا؟"

انھوں نے حسبِ عادت بس ایک لفظ پکڑ لیا۔ کہنے لگے "ٹھیک کہتے ہو جس طرح آج کل کسی کی عمر یا تنخواہ دریافت کرنا بُری بات سمجھی جاتی ہے، اسی طرح بالکل اسی طرح بیس سال بعد کسی کی ولدیّت پُوچھنا بداَخلاقی سمجھی جائے گی!"

اب مجھے مرزا کی چونچال طبیعت سے خطرہ محسُوس ہونے لگا۔ لہٰذا انھیں ولدیّت کے مستقبل پر مسکراتا چھوڑ کر میں آٹھ دس قبر دُور ایک ٹکڑی میں شامل ہو گیا، جہاں ایک صاحب جنّت مکانی کے حالاتِ زندگی مزے لے لے کر بیان کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ خُدا

غریقِ رحمت کرے مرحوم نے اتنی لمبی عُمر پائی کہ ان کے قریبی اعزّہ دس پندرہ سال سے ان کی انشورنس پالیسی کی امّید میں جی رہے تھے۔ ان امّیدواروں میں سے بیشتر کو مرحوم خود اپنے ہاتھ سے مٹّی دے چکے تھے۔ بقیہ کو یقین ہو گیا تھا کہ مرحوم نے آبِ حیات نہ صرف چکھا ہے بلکہ ڈگڈگا کے پی چکے ہیں۔ راوی نے تو یہاں تک بیان کیا کہ از بسکہ مرحوم شروع سے رکھ رکھاؤ کے حد درجہ قائل تھے، لہٰذا آخر تک اس صحت بخش عقیدے پر قائم رہے کہ چھوٹوں کو تعظیماً پہلے مرنا چاہیے۔ البتّہ ادھر چند برسوں سے ان کو فلکِ کج رفتار سے یہ شکایت ہو چلی تھی کہ افسوس اب کوئی دشمن ایسا باقی نہیں رہا، جسے وہ مرنے کی بد دُعا دے سکیں۔

ان سے کٹ کر میں ایک دُوسری ٹولی میں جا ملا۔ یہاں مرحوم کے ایک شناسا اور میرے پڑوسی ان کے گیلڑ لڑکے کو صبرِ جمیل کی تلقین اور گول مول الفاظ میں نعم البدل کی دُعا دیتے ہُوئے فرما رہے تھے کہ برخوردار! یہ مرحوم کے مرنے کے دن نہیں تھے۔ حالانکہ پانچ منٹ پہلے یہی صاحب، جی ہاں، یہی صاحب مجھ سے کہہ رہے تھے کہ مرحوم نے پانچ سال قبل دونوں بیویوں کو اپنے تیسرے سہرے کی بہاریں دکھائی تھیں اور یہ ان کے مرنے کے نہیں، ڈوب مرنے کے دن تھے۔ مجھے اچھّی طرح یاد ہے کہ انھوں نے انگلیوں پر حساب لگا کر کانا پھوسی کے انداز میں یہ تک بتایا کہ تیسری بیوی کی عُمر مرحوم کی پنشن کے برابر ہے۔ مگر ہے بالکل سیدھی اور بے زبان۔ اس اللہ کی بندی نے کبھی پلٹ کر نہیں پُوچھا کہ تمھارے مُنہ میں کے دانت نہیں ہیں۔ مگر مرحوم اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ انھوں نے محض اپنی دعاؤں کے زور سے موصوفہ کا چال چلن قابُو میں کر رکھا ہے۔ البتّہ بیاہتا بیوی سے ان کی کبھی نہیں بنی۔ بھری جوانی میں بھی میاں بیوی ۶۲ کے ہندسے کی طرح ایک دُوسرے سے منہ پھیرے رہے اور جب تک جیئے ایک دُوسرے کے اعصاب پر سوار رہے۔ ممدوحہ نے مشہُور کر رکھّا تھا کہ

(خدا ان کی رُوح کو نہ شرمائے) مرحُوم شروع سے ہی ایسے ظالم تھے کہ ولیمے کا کھانا بھی مجھ نئی نویلی دُلھن سے پکوایا۔

میں نے گفتگو کا رُخ موڑنے کی خاطر گنجان قبرستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ دیکھتے ہی دیکھتے چپّہ چپّہ آباد ہو گیا۔ مرزا حسب معمُول پھر بیچ میں کُود پڑے۔ کہنے لگے، دیکھ لینا وہ دن زیادہ دُور نہیں جب کراچی میں مُردے کو کھڑا گاڑنا پڑے گا اور نائیلون کے ریڈی میڈ کفن میں اُوپر زپ (ZIP) لگے گی تاکہ منہ دیکھنے دکھانے میں آسانی رہے۔

میری طبیعت ان باتوں سے اوبنے لگی تو ایک دُوسرے غول میں چلا گیا، جہاں دو نوجوان ستار کے خلاف جیسی پتلُونیں چڑھائے چہک رہے تھے۔ پہلے "ٹیڈی بوائے" کی پیلی قمیض پر لڑکیوں کی ایسی واہیات تصویریں بنی ہوئی تھیں کہ نظر پڑتے ہی ثقہ آدمی لاحول پڑھنے لگتے تھے اور ہم نے دیکھا کہ ہر ثقہ آدمی بار بار لاحول پڑھ رہا ہے۔ دُوسرے نوجوان کو مرحُوم کی بے وقت موت سے واقعی دلی صدمہ پہنچا تھا، کیونکہ اس کا سارا "ویک اینڈ" چوپٹ ہو گیا تھا۔

چونچوں اور چُہلوں کا یہ سلسلہ شاید کچھ دیر اور جاری رہتا کہ اتنے میں ایک صاحب نے ہمّت کر کے مرحُوم کے حق میں پہلا کلمۂ خیر کہا اور میری جان میں جان آئی۔ انھوں نے صحیح فرمایا "یوں آنکھ بند ہونے کے بعد لوگ کیڑے نکالنے لگیں، یہ اور بات ہے، مگر خدا ان کی قبر کو عنبریں کرے، مرحُوم بلاشبہ صاف دل، نیک نیّت انسان تھے اور نیک نام بھی۔ یہ بڑی بات ہے۔"

"نیک نامی میں کیا کلام ہے۔ مرحُوم اگر یونہی منہ ہاتھ دھونے بیٹھ جاتے تو سب یہی سمجھتے کہ وضو کر رہے ہے......" جملہ ختم ہونے سے پہلے مدّاح کی چمکتی چندیا یکایک ایک دھنسی ہُوئی قبر میں غرُوب ہو گئی۔

اِس مقام پر ایک تیسرے صاحب نے (جن سے میں واقف نہیں) "رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُوسیاہ" والے لہجے میں نیک نیّتی اور صاف دلی کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ اپنی پیدائشی بُزدلی کے سبب تمام عمر گناہوں سے بچے رہتے ہیں۔ اِس کے برعکس بعضوں کے دل و دماغ واقعی آئینے کی طرح صاف ہوتے ہیں ـــــ یعنی نیک خیال آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔

شامتِ اعمال کہ میرے منہ سے نکل گیا "نیّت کا حال صرف خدا پر روشن ہے مگر اپنی جگہ یہی کیا کم ہے کہ مرحوم سب کے دُکھ سکھ میں شریک اور ادنیٰ سے ادنیٰ پڑوسی سے بھی جُھک کر ملتے تھے۔"

ارے صاحب! یہ سنتے ہی وہ صاحب تو لال بھبوکا ہو گئے۔ بولے "حضرت! مجھے خدائی کا دعویٰ تو نہیں۔ تاہم اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اکثر بُوڑھے خرانٹ اپنے پڑوسیوں سے محض اس خیال سے جُھک کر ملتے ہیں کہ اگر وہ خفا ہو گئے تو کندھا کون دے گا۔"

خوش قسمتی سے ایک خدا ترس نے میری حمایت کی۔ میرا مطلب ہے مرحوم کی حمایت کی۔ انھوں نے کہا کہ مرحوم نے، ماشاءاللہ، اِتنی لمبی عمر پائی۔ مگر صُورت پر ذرا نہیں برستی تھی۔ چنانچہ سوائے کنپٹیوں کے اور بال سفید نہیں ہُوئے۔ چاہتے تو خضاب لگا کے خوردوں میں شامل ہو سکتے تھے مگر طبیعت ایسی قلندرانہ پائی تھی کہ خضاب کا کبھی جھوٹوں بھی خیال نہیں آیا۔

وہ صاحب سچ مچ پھٹ پڑے "آپ کو خبر بھی ہے؟ مرحوم کا سارا سر پہلے نکاح کے بعد ہی سفید گالا ہو گیا تھا۔ مگر کنپٹیوں کو وہ قصداً سفید رہنے دیتے تھے تاکہ کسی کو شبہ نہ گزرے کہ خضاب لگاتے ہیں۔ سلور گرے قلمیں! یہ تو ان کے میک اپ میں ایک ٹیکنیکل ٹچ تھا!"

"ارے صاحب! اسی مصلحت سے انھوں نے اپنا ایک مصنوعی دانت بھی توڑ رکھا تھا" ایک دُوسرے بدگو نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی۔

"کچھ بھی سہی وہ ان کھوسٹوں سے ہزار درجے بہتر تھے جو اپنے پوپلے منہ اور سفید بالوں کی داد چھوٹوں سے یُوں طلب کرتے ہیں، گویا یہ ان کی ذاتی جدّوجہد کا ثمرہ ہے"۔ مرزا نے بگڑی بات بنائی۔

اُن سے پیچھا چھڑا کر کچّی پکّی قبریں پھاندتا میں منشی ثناء اللہ کے پاس جا پہنچا جو ایک کتبے سے ٹیک لگائے، بیری کے ہرے ہرے پتّے کچر کچر چبا رہے تھے اور اس امر پر بار بار اپنی حیرانی کا اظہار فرما رہے تھے کہ ابھی پرسوں تک تو مرحوم باتیں کر رہے تھے۔ گویا ان کے اپنے آدابِ جانکنی کی رُو سے مرحوم کو مرنے سے تین چار سال پہلے چُپ ہو جانا چاہیے تھا۔

بھلا مرزا ایسا موقع کہاں خالی جانے دیتے تھے۔ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے، یاد رکھو! مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں نکلتا ہے۔

یوں تو مرزا کے بیان کے مطابق مرحوم کی بیوائیں بھی ایک دُوسرے کی چھاتی پر دوہتّڑ مار مار کر بین کر رہی تھیں، لیکن مرحوم کے بڑے نواسے نے جو پانچ سال سے بے روزگار تھا، چیخ چیخ کر اپنا گلا بٹھا لیا تھا۔ منشی جی بیری کے پتّوں کا رس چُوس چُوس کر جتنا اسے سمجھاتے پچکارتے، اتنا ہی وہ مرحوم کی پنشن کو یاد کر کے دھاڑیں مار مار کر روتا۔ اسے اگر ایک طرف حضرت عزرائیل سے گلہ تھا کہ انھوں نے تیس تاریخ تک انتظار کیوں نہ کیا تو دُوسری طرف خود مرحوم سے بھی سخت شکوہ تھا

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور؟

ادھر منشی جی کا سارا زور اس فلسفے پر تھا کہ برخوردار! یہ سب نظر کا دھوکا ہے۔

درحقیقت زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں۔ کم از کم ایشیا میں۔ نیز مرحوم بڑے نصیبہ ور نکلے کہ دُنیا کے بکھیڑوں سے اتنی جلدی آزاد ہو گئے۔ مگر تم ہو کہ ناحق اپنی جوان جان کو ہلکان کیے جا رہے ہو۔ یونانی مثل ہے کہ

وہی مرتا ہے جو محبوبِ خدا ہوتا ہے

حاضرین ابھی دل ہی دل میں حسد سے جلے جا رہے تھے کہ ہائے، مرحوم کی آئی ہمیں کیوں نہ آگئی کہ دم بھر کو بادل کے ایک فالسئی ٹکڑے نے سورج کو ڈھک لیا اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ منشی جی نے یکبارگی بیری کے پتّوں کا پھوک نگلتے ہوئے اس کو مرحوم کے بہشتی ہونے کا غیبی شگون قرار دیا۔ لیکن مرزا نے بھرے مجمع میں سر ہلا ہلا کر اس پیشگوئی سے اختلاف کیا۔ میں نے الگ لے جا کر وجہ پوچھی تو ارشاد ہُوا:

"مرنے کے لیے سنیچر کا دن بہت منحوس ہوتا ہے۔"

لیکن سب سے زیادہ پتلا حال مرحوم کے ایک دوست کا تھا، جن کے آنسو کسی طرح تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے کہ انھیں مرحوم سے دیرینہ ربط و رفاقت کا دعویٰ تھا۔ اس رُوحانی یک جہتی کے ثبوت میں اکثر اس واقعے کا ذکر کرتے کہ بغدادی قاعدہ ختم ہونے سے ایک دن پہلے ہم دونوں نے ایک ساتھ سگرٹ پینا سیکھا۔ چنانچہ اس وقت بھی صاحبِ موصُوف کے بین سے صاف ٹپکتا تھا کہ مرحوم کسی سوچے سمجھے منصُوبے کے تحت داغ بلکہ دغا دے گئے اور بغیر کہے سُنے پیچھا چھڑا کے چُپ چپاتے جنّت الفردوس کو روانہ ہو گئے ——— اکیلے ہی اکیلے!

بعد میں مرزا نے صراحتہً بتایا کہ باہمی اخلاص و یگانگت کا یہ عالم تھا کہ مرحوم نے اپنی موت سے تین ماہ بیشتر موصُوف سے دس ہزار روپے سکّہ رائج الوقت بطورِ قرضِ حسنہ

لیے اور وہ تو کہیے، بڑی خیریت ہوئی کہ اسی رقم سے تیسری بیوی کا مہرِ معجّل بیباق کر گئے ورنہ قیامت میں اپنے ساس سسر کو کیا مُنہ دکھاتے۔

(۲)

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ گنجان محلّوں میں مختلف بلکہ متضاد تقریبیں ایک دوسرے میں بڑی خوبی سے ضم ہو جاتی ہیں۔ گویا دونوں وقت مل رہے ہوں۔ چنانچہ اکثر حضرات دعوتِ ولیمہ میں ہاتھ دھوتے وقت چہلم کی بریانی کی ڈکار لیتے، یا سویم میں شبینہ فتوحات کی لذیذ داستان سُناتے پکڑے جاتے ہیں۔ لذّتِ ہمسائیگی کا یہ نقشہ بھی اکثر دیکھنے میں آیا کہ ایک کوارٹر میں ہنسی موں منایا جا رہا ہے تو رت جگا دیوار کے اس طرف ہو رہا ہے۔ اور یوں بھی ہوتا ہے کہ دائیں طرف والے گھر میں آدھی رات کو قوال بلّیاں لڑا رہے ہیں، تو حال بائیں طرف والے گھر میں آ رہا ہے۔ آمدنی ہمسائے کی بڑھتی ہے تو اس خوشی میں ناحق خرچ ہمارے گھر کا بڑھتا ہے اور یہ سانحہ بھی بارہا گزرا کہ چھلی طرحدار پڑوسن نے پکائی اور

مدّتوں اپنے بدن سے تری خوشبو آئی

اس تقریبی گھپلے کا صحیح اندازہ مجھے دوسرے دن ہوا جب ایک شادی کی تقریب میں تمام وقت مرحوم کی وفاتِ حسرت آیات کے تذکرے ہوتے رہے۔ ایک بزرگ نے کہ صُورت سے خود پابہ رکاب معلوم ہوتے تھے، تشویش ناک لہجے میں پُوچھا، آخر ہُوا کیا؟ جواب میں مرحُوم کے ایک ہم جماعت نے اِشاروں کنایوں میں بتایا کہ مرحُوم جوانی میں اشتہاری اَمراض کا شکار ہو گئے۔ ادھیڑ عمر میں جنسی تونس میں مبتلا رہے۔ لیکن آخری ایّام میں تقویٰ ہو گیا تھا۔

"پھر بھی آخر ہوا کیا؟" پا بہ رکاب مرد بزرگ نے اپنا سوال دُہرایا۔
"بھلے چنگے تھے۔ اچانک ایک ہچکی آئی اور جاں بحق ہو گئے" دوسرے بزرگ نے انگوچھے سے ایک فرضی آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔
"سنا ہے چالیس برس سے مرض الموت میں مبتلا تھے" ایک صاحب نے سوکھے سے منہ سے کہا۔
"کیا مطلب؟"
"چالیس برس سے کھانسی میں مبتلا تھے اور آخر اسی میں انتقال فرمایا۔"
"صاحب! جنّتی تھے کہ کسی اجنبی مرض میں نہیں مرے۔ ورنہ اب تو میڈیکل سائنس کی ترقّی کا یہ حال ہے کہ روز ایک نیا مرض ایجاد ہوتا ہے۔"
"آپ نے گاندھی گارڈن میں اس بوہری سیٹھ کو کار میں چہل قدمی کرتے نہیں دیکھا جو کہتا ہے کہ میں ساری عمر دمے پر اتنی لاگت لگا چکا ہوں کہ اب اگر کسی اور مرض میں مرنا پڑا تو خدا کی قسم، خودکشی کر لوں گا۔" مرزا چٹکلوں پر اتر آئے۔
"واللہ! موت ہو تو ایسی ہو! (سسکی) مرحوم کے ہونٹوں پر عالمِ سکرات میں بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔"
"اپنے قرض خواہوں کا خیال آ رہا ہوگا" مرزا میرے کان میں بھنبھنائے۔
"گنہ گاروں کا منہ مرتے وقت سؤر جیسا ہو جاتا ہے، مگر چشمِ بد دور۔ مرحوم کا چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔"
"صاحب! سلیٹی رنگ کا گلاب ہم نے آج تک نہیں دیکھا" مرزا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ناک میرے کان کو چھونے لگی اور ان کے منہ سے کچھ ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے

کوئی بچہ چمکیلے فرنیچر پر گیلی انگلی رگڑ رہا ہو۔

اصل الفاظ تو ذہن سے محو ہو گئے، لیکن اتنا اب بھی یاد ہے کہ انگوچھے والے بزرگ نے ایک فلسفیانہ تقریر کر ڈالی، جس کا مفہوم کچھ ایسا ہی تھا کہ جینے کا کیا ہے۔ جینے کو تو جانور بھی جی لیتے ہیں، لیکن جس نے مرنا نہیں سیکھا، وہ جینا کیا جانے۔ ایک متبسم خودسپردگی، ایک بے تاب آمادگی کے ساتھ مرنے کے لیے ایک عمر کا ریاض درکار ہے۔ یہ بڑے ظرف، بڑے حوصلے کا کام ہے، بندہ نواز!

پھر انھوں نے بے موت مرنے کے خاندانی نسخے اور ہنستے کھیلتے اپنی رُوح قبض کرانے کے پینترے کچھ ایسے اُستادانہ تیور سے بیان کیے کہ ہمیں عطائی مرنے والوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نفرت ہو گئی۔

نتیجۂ کلام اس پر ہُوا کہ مرحوم نے کسی رُوحانی ذریعے سے سُن گن پا لی تھی کہ [illegible] سنیچر کو وہ [illegible] گا۔

"[illegible] پہنچنے والے کے متعلق یہی کہا جاتا ہے" بانسو بر قمیض والا ٹیڈی بوائے بولا۔

"کیا وہ سنیچر کو مر جائے گا؟" مرزا نے اس بدلگام کا منہ بند کیا۔

انگوچھے والے بزرگ نے نسخے مذکور سے پہلے اپنے نری کے جوتے کی گرد جھاڑی، پھر [illegible] پسینہ پونچھتے ہوئے مرحوم کے عرفانِ مرگ کی شہادت دی کہ جنت مکانی نے وصال سے ٹھیک [illegible] دن پہلے مجھ سے فرمایا تھا کہ انسان فانی ہے!

انسان کے متعلق یہ تازہ خبر سُن کر مرزا مجھے تخلیے میں لے گئے۔ دراصل تخلیے کا لفظ انھوں نے [illegible] استعمال کیا تھا، ورنہ جس جگہ وہ مجھے دھکیلتے ہوئے لے گئے وہ زنانے اور مردانے کی سرحد پر ایک چبوترہ تھا، جہاں ایک میراثن گھونگھٹ نکالے ڈھولک پر گجّا دیا

گا رہی تھی۔ وہاں انھوں نے اس شغف کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جو مرحوم کو اپنی موت سے تھا، مجھے آگاہ کیا کہ یہ ڈراما تو جنت مکانی اکثر کھیلا کرتے تھے۔ آدھی آدھی رات کو اپنی ہونے والی بیواؤں کو جگا کر دھمکیاں دیتے کہ میں اچانک اپنا سایہ تمھارے سر سے اٹھا لوں گا۔ چشم زدن میں مانگ اُجاڑ دوں گا۔ اپنے بے تکلف دوستوں سے بھی کہا کرتے تھے کہ واللہ! اگر خودکشی جرم نہ ہوتی تو کبھی کا اپنے گلے میں پھندا ڈال لیتا۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ اپنے آپ کو مردہ تصور کر کے ڈکرانے لگتے اور چشمِ تصور سے بیوی کے سونے سونے ہاتھ دیکھ کر کہتے: بخدا! میں تمھارا رنڈاپا نہیں دیکھ سکتا۔ مرنے والے کی ایک ایک خوبی بیان کر کے خشک سسکیاں بھرتے اور سسکیوں کے درمیان سگرٹ کے کش لگاتے اور جب اس عمل سے اپنے اُوپر رقت طاری کر لیتے تو رومال سے بار بار آنکھ کے بجائے اپنی ڈبڈبائی ہوئی ناک پونچھتے جاتے۔ پھر جب شدتِ گریہ سے ناک سرخ ہو جاتی تو ذرا صبر آتا اور وہ عالمِ تصور میں اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے تینوں بیواؤں کی مانگ میں یکے بعد دیگرے ڈھیروں افشاں بھرتے۔ اس سے فارغ ہو کر ہر ایک کو کہنیوں تک مہین مہین پھنسی پھنسی چوڑیاں پہناتے (ربیا [illegible] کو چار چوڑیاں کم پہناتے تھے)۔

حالانکہ اس سے پہلے بھی مرزا کو کئی مرتبہ ٹوک چکا تھا کہ خاقانیِ ہند استاد ذوق ہر قصیدے کے بعد منہ بھر بھر کے کلیاں کیا کرتے تھے۔ تم پہ ہر کلمے، ہر فقرے کے بعد [illegible] واجب ہیں۔ لیکن اس وقت مرحوم کے بارے میں یہ اول جلول باتیں اور ایسے لہجے میں سن کر میری طبیعت کچھ زیادہ ہی منغض ہو گئی۔ میں نے دوسروں پر ڈھال کر [illegible] سنائی:

"یہ کیسے مسلمان ہیں مرزا! دعائے مغفرت نہیں کرتے۔ نہ کریں، مگر ایسی باتیں

کیوں بناتے ہیں یہ لوگ؟"

"خلقِ خدا کی زبان کس نے پکڑی ہے۔ لوگوں کا منہ تو جہلم کے نوالے ہی سے بند ہوتا ہے۔"

(۳)

مجھے جہلم میں بھی شرکت کا اتفاق ہوا۔ لیکن سوائے ایک نیک طینت مولوی صاحب کے جو پلاؤ کے چاولوں کی لمبائی اور گلاوٹ کو مرحوم کے بحیثیت جنّتی ہونے کی نشانی قرار دے رہے تھے، بقیہ حضرات کی گل افشانیِ گفتار کا وہی انداز تھا۔ وہی جگ جگے تھے، وہی چھینٹے!

ایک بزرگوار جو نان قورمے کے ہر آتشیں لقمے کے بعد آدھا آدھا گلاس پانی پی کر نہ صرف سیر بلکہ سیراب ہو گئے تھے، منہ لال کر کے بولے کہ مرحوم کی اولاد نہایت ناخلف نکلی۔ مرحوم (مغفور) شد و مد سے وصیت فرما گئے تھے کہ میری مٹی بغداد لے جائی جائے۔ لیکن نافرمان اولاد نے ان کی آخری خواہش کا ذرا پاس نہ کیا۔

اس پر ایک منہ پھٹ پڑوسی بول اٹھے "صاحب! یہ مرحوم کی سراسر زیادتی تھی کہ انھوں نے خود تو تادمِ مرگ میونسپل حدود سے قدم باہر نہیں نکالا۔ حد یہ کہ پاسپورٹ تک نہیں بنوایا ......"

ایک وکیل صاحب نے قانونی موشگافی کی "بین الاقوامی قانون کے بموجب پاسپورٹ کی شرط صرف زندوں کے لیے ہے۔ مُردے پاسپورٹ کے بغیر بھی جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔"

"لے جائے جا سکتے ہیں" مرزا پھر لقمہ دے گئے۔

"میں کہہ یہ رہا تھا کہ یُوں تو ہر مرنے والے کے سینے میں یہ خواہش سلگتی رہتی ہے کہ میرا کانسی کا مجسمہ (جسے قدِ آدم بنانے کے لیے بسا اوقات اپنی طرف سے پُورے ایک فٹ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے) میونسپل پارک کے بیچوں بیچ استادہ کیا جائے اور ــــ"

"اور جُملہ نازنینانِ شہر چار مہینے دس دن تک میرے لاشے کو گود میں لیئے بال بکھرائے بیٹھی رہیں" مرزا نے دُوسرا مصرع لگایا۔

"مگر صاحب! وصیّتوں کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ہمارے بچپن کا قصّہ ہے پیپل والی حویلی کے پاس ایک جھونپڑی میں ۳۹ سنہ تک ایک افیمی رہتا تھا۔ ہمارے محتاط اندازے کے مُطابق عمر ۶۶ سال سے کسی طرح کم نہ ہوگی، اس لیے کہ خُود کہتا تھا کہ پینسٹھ سال سے تو افیم کھا رہا ہُوں۔ چوبیس گھنٹے انٹا غفیل رہتا تھا۔ ذرا نشہ ٹوٹتا تو مغموم ہو جاتا۔ غم یہ تھا کہ دنیا سے بے اولاد جا رہا ہوں۔ اللہ نے کوئی اولادِ نرینہ نہ دی جو اس کی بان کی چارپائی کی جائز وارث بن سکے! اس کے متعلّق محلّے میں مشہور تھا کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے نہیں نہایا ہے۔ اس کو اتنا تو ہم نے بھی کہتے سُنا کہ خدا نے پانی صرف پینے کے لیے بنایا تھا مگر انسان بڑا ظالم ہے

راحتیں اور بھی ہیں غُسل کی راحت کے سوا

ہاں تو صاحب! جب اس کا دم آخر ہونے لگا تو محلّے کی مسجد کے امام کا ہاتھ اپنے ڈوبتے دل پر رکھ کر یہ قول و قرار کیا کہ میری میّت کو غُسل نہ دیا جائے۔ بس پولے پولے ہاتھوں سے تیمّم کرا کے کفنا دیا جائے ورنہ حشر میں دامن گیر ہوں گا۔"

وکیل صاحب نے تائید کرتے ہُوئے فرمایا "اکثر مرنے والے اپنے کرنے کے کام پسماندگان کو سونپ کر ٹھنڈے ٹھنڈے سدھار جاتے ہیں۔ پچھلی گرمیوں میں دیوانی

عدالتیں بند ہونے سے چند یوم قبل ایک مقامی شاعر کا انتقال ہُوا۔ واقعہ ہے کہ اُن کے جیتے جی کسی فلمی رسالے نے بھی ان کی عُریاں نظموں کو شرمندۂ طباعت نہ کیا۔ لیکن آپ کو حیرت ہوگی کہ مرحوم اپنے بھتیجے کو ایصالِ ثواب کی یہ راہ سجھا گئے کہ بعدِ مُردن میرا کلام حنائی کاغذ پر چھپوا کر سال کے سال میری برسی پر فقیروں اور مُدیروں کو بلا ہدیہ تقسیم کیا جائے۔

پڑوسی کی ہمّت اور بڑھی ''اب مرحوم ہی کو دیکھیے۔ زندگی میں ہی ایک قطعۂ اراضی اپنی قبر کے لیے بڑے ارمانوں سے رجسٹری کرا لیا تھا گو کہ بچارے اس کا قبضہ پُورے بارہ سال بعد لے پائے۔ نصیحتوں اور وصیتوں کا یہ عالم تھا کہ موت سے دس سال پیشتر اپنے نواسوں کے ایک فہرست حوالے کر دی تھی، جس میں نام بنام لکھا تھا کہ فلاں ولد فلاں کو میرا مُنہ نہ دکھایا جائے۔ (جن حضرات سے زیادہ آزردہ خاطر تھے، ان کے نام کے آگے ولدیّت نہیں لکھی تھی) تیسری شادی کے بعد انھیں اس کا طویل ضمیمہ مرتّب کرنا پڑا، جس میں تمام جوان پڑوسیوں کے نام شامل تھے۔''

''ہم نے تو یہاں تک سُنا ہے کہ مرحوم نہ صرف اپنے جنازے میں شرکا کی تعداد متعیّن کر گئے بلکہ آج کے چہلم کا 'مینو' بھی خود ہی طے فرما گئے تھے۔'' وکیل نے خاکے میں شوخ رنگ بھرا۔

اس نازک مرحلے پر خشخشی ڈاڑھی والے بزرگ نے پلاؤ سے سیر ہو کر اپنے شکم پر ہاتھ پھیرا اور 'مینو' کی تائید و توصیف میں ایک مسلسل ڈکار داغی، جس کے اختتام پر اس معصوم حسرت کا اظہار فرمایا کہ کاش آج مرحوم زندہ ہوتے تو یہ انتظامات دیکھ کر کتنے خوش ہوتے!

اب پڑوسی نے تیغِ زبان کو بے نیام کیا ''مرحوم سدا سے سوءِ ہضم کے مریض تھے۔

غذا تو غذا، بچارے کے پیٹ میں بات تک نہیں ٹھیرتی تھی۔ چٹ پٹی چیزوں کو ترستے ہی مرے۔ میرے گھر میں سے بتا رہی تھیں کہ ایک دفعہ ملیریا میں سرسام ہو گیا اور لگے بہکنے۔ بار بار اپنا سر منجھلی کے زانو پر پٹختے اور سہاگ کی قسم دلا کر یہ وصیّت کرتے تھے کہ ہر جُمعرات کو میری فاتحہ، چاٹ اور کنواری بکری کی سری پر دلائی جائے"۔

مرزا پھڑک ہی تو گئے۔ ہونٹ پر زبان پھیرتے ہُوئے بولے "صاحب! وصیّتوں کی کوئی حد نہیں۔ ہمارے محلّے میں ڈیڑھ پونے دو سال پہلے ایک اسکول ماسٹر کا انتقال ہُوا، جنھیں میں نے عید بقرعید پر بھی سالم و ثابت پاجامہ پہنے نہیں دیکھا۔ مگر مرنے سے پہلے وُہ بھی اپنے لڑکے کو ہدایت کر گئے کہ

پُل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا!

لیکن حضور ابّا کی آخری وصیّت کے مطابق فیض کے اسباب بنانے میں لڑکے کی مُفلسی کے علاوہ مُلک کا قانون بھی مزاحم ہُوا"۔

"یعنی کیا؟" وکیل صاحب کے کان کھڑے ہُوئے۔

"یعنی یہ کہ آج کل پُل بنانے کی اجازت صرف پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کو ہے۔ اور بالفرضِ محال کراچی میں چار فٹ گہرا کنواں کھود بھی لیا تو پولیس اس کا کھاری کیچڑ پینے والوں کا چالان اقدامِ خودکشی میں کر دے گی۔ یُوں بھی چٹیچر سے چٹیچر قصبے میں آج کل کنوئیں صرف ایسے ویسے موقعوں پر ڈوب مرنے کے لیے کام آتے ہیں۔ رہے تالاب، تو حضور! لے دے کے ان کا یہ مصرف رہ گیا ہے کہ دن بھر ان میں گاؤں کی بھینسیں نہائیں اور صُبح جیسی آئی تھیں، اس سے کہیں زیادہ گندی ہو کر چراغ جلے باڑے میں پہنچیں"۔

خدا خدا کر کے یہ مکالمہ ختم ہوا تو پانخوں کا سلسلہ شروع ہو گیا:

"مرحوم نے کچھ چھوڑا بھی؟"

"بچے چھوڑے ہیں!"

"مگر دوسرا امکان بھی تو ہے۔"

"اس کے کرایہ کو اپنے مزار کی سالانہ مرمت سفیدی کے لیے وقف کر گئے ہیں۔"

"پڑوسیوں کا کہنا ہے کہ بیاہتا بیوی کے لیے ایک انگوٹھی بھی چھوڑی ہے۔ اگر اس کا نگینہ اصلی ہوتا تو کسی طرح بیس ہزار سے کم کی نہیں تھی۔"

"تو کیا نگینہ جھوٹا ہے؟"

"جی نہیں۔ اصلی امی ٹیشن ہے!"

"اور وہ پچاس ہزار کی انشورنس پالیسی کیا ہوئی؟"

"وہ پہلے ہی منجھلی کے مہر میں لکھ چکے تھے۔"

"اس کے بارے میں یار لوگوں نے لطیفہ گھڑ رکھا ہے کہ منجھلی بیوہ کہتی ہے کہ سرتاج کے بغیر زندگی اجیرن ہے۔ اگر کوئی ان کو دوبارہ زندہ کر دے تو میں بخوشی دس ہزار لوٹانے پر تیار ہوں۔"

"ہم نے نجی ذرائع سے سنا ہے کہ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، مرحوم منجھلی پر ایسے لہلوٹ تھے کہ اب بھی رات برات خوابوں میں آ آ کر ڈراتے ہیں۔"

"مرحوم اگر ایسا کرتے ہیں تو بالکل ٹھیک کرتے ہیں۔ ابھی تو ان کا کفن بھی

میلا نہیں ہوا ہوگا۔ مگر سننے میں یہ آیا ہے کہ بجلی نیچے لگ گئی ہے، دیمک نے اُدھیڑنا شروع کر دیا ہے۔"

"اگر مجھ ایسا آدمی ہے تو بالکل ٹھیک کرتی ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک زمانے میں لکھنؤ کے نچلے طبقے میں یہ رواج تھا کہ جنازے کے ہمراہ صرف انواع و اقسام کے پُر تکلف کھانوں کا اہتمام کیا جاتا بلکہ ... سوا ... کی کوشش کی جاتی تھی تاکہ مرحوم کی ... روح کما حقہٗ متمتع ہو سکے۔" مرزا نے ح اور غ صحیح مخرج سے ادا کر ... موقعہ پر آخری ... لگا دیا۔

دلچسپی برقرار ... میں نے مرزا کو آڑے ہاتھوں لیا، "جمعہ کو تم نے وعظ نہیں سنا؟ مولوی صاحب نے کہا تھا کہ مرنے والوں کا ذکر کرو تو اچھائی کے ساتھ۔ موت کو نہ بھولو کہ ایک نہ ایک دن سب کو آنی ہے۔"

سڑک پار کرتے کرتے ایک دم بیچ ہی میں اکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ فرمایا "اگر کوئی مولوی یہ ذمہ لے کہ مرنے کے بعد میرے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ لکھا جائے گا تو آج ہی —— اسی وقت، اسی جگہ مرنے کے لیے تیار ہوں۔ تمہاری جان کی قسم!"

آخری فقرہ مرزا نے ایک بے صبری کار کے بمپر پر تقریباً اکڑوں بیٹھ کر جاتے ہوئے ادا کیا۔

(جولائی ١٩٦١ء)

رہل اسٹیشن

ان دنوں مرزا کے اعصاب پر رہل اسٹیشن بُری طرح سوار تھا۔ لیکن ہمارا حال ان سے بھی زیادہ خستہ تھا۔ اس لیے کہ ہم پر مرزا اپنے متاثرہ اعصاب اور رہل اسٹیشن سمیت سوار تھے جان ضیق میں تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اسی کا ذکر، اسی کا وِرد۔ ہُوا یہ کہ وہ سرکاری خرچ پر دو دِن کے لیے کوئٹہ ہو آئے تھے اور اب اس پر مچلے تھے کہ ہم بلا تنخواہ رخصت پر اُن کے ساتھ دو مہینے وہاں گزار آئیں، جیسا کہ گرمیوں میں شرفا و عمائدینِ کراچی کا دستور رہے۔ ہم نے کہا، سچ پُوچھو تو ہم اسی لیے وہاں نہیں جانا چاہتے کہ جن لوگوں کے سائے سے ہم کراچی میں سال بھر بچتے پھرتے ہیں، وہ سب مئی جون میں وہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ بولے ٹھیک کہتے ہو۔ مگر بندۂ خدا! اپنی صحت تو دیکھو۔ تمھیں اپنے بال بچّوں پر ترس نہیں آتا؟ کب تک حکیم ڈاکٹروں کا پیٹ پالتے رہو گے؟ وہاں پہنچتے ہی بغیر دوا کے چاق چوبند ہو جاؤ گے۔ پانی میں دوا کی تاثیر ہے اور (مُسکراتے ہُوئے) کسی کسی دن مزا بھی ویسا ہی۔ یُوں بھی جو وقت پہاڑ پر گُزرے، عُمر سے منہا نہیں کیا جاتا۔ مکھی مچھر کا نام نہیں۔ کیچڑ ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اس لیے کہ پانی کی سخت قلّت ہے۔ لوگوں کی تندرستی کا حال تمھیں کیا بتاؤں۔ جسے دیکھو، گالوں سے گُلابی رنگ ٹپکا پڑ رہا ہے۔ ابھی پچھلے سال وہاں ایک وزیر نے اسپتال کا افتتاح کیا تو تین دن پہلے ایک مریض کو کراچی سے بلوانا پڑا اور اس کی نگرانی پر چار بڑے ڈاکٹر تعینات کیے گئے، رکھ

کہیں وہ رسمِ افتتاح سے پہلے ہی صحت یاب نہ ہوجائے۔ ہم نے کہا، آب وہوا اپنی جگہ، مگر ہم دوا کے بغیر اپنے تئیں نارمل محسوس نہیں کرتے۔ بولے، اس کی فکر نہ کرو۔ کوئٹہ میں آنکھ بند کرکے کسی بھی بازار میں نکل جاؤ۔ ہر تیسری دکان دواؤں کی ملے گی اور ہر دوسری دکان تنوری روٹیوں کی۔ پوچھا، اور پہلی دکان؟ بولے اس میں ان دکانوں کے لیے سائن بورڈ تیار کیے جاتے ہیں۔ ہم نے کہا لیکن کراچی کی طرح وہاں قدم قدم پر ڈاکٹر کہاں؟ آج کل تو بغیر ڈاکٹر کی مدد کے آدمی مر بھی نہیں سکتا۔ کہنے لگے، چھوڑو بھی! فرضی بیماریوں کے لیے تو یونانی دوائیں تیر بہدف ہوتی ہیں۔

ہمارے بے جا شکوک اور غلط فہمیوں کا اس مدلل طریقے سے ازالہ کرنے کے بعد انھوں نے اپنا وکیلوں کا سا لب و لہجہ چھوڑا اور بڑی گرم جوشی سے ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر "ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں" والے انداز میں کہا "بھئی! اب تمھارا شمار بھی حیثیت داروں میں ہونے لگا۔ جبھی تو بنک کو پانچ ہزار قرض دینے میں ذرا پس و پیش نہ ہوا۔ واللہ! میں حسد نہیں کرتا۔ خدا جلد تمھاری حیثیت میں اتنی ترقی دے کہ پچاس ہزار تک مقروض ہو سکو۔ میں اپنی جگہ صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ اب تمھیں اپنے انکم بریکٹ* والوں کی طرح گرمیاں گزارنے ہل اسٹیشن جانا چاہیے۔ یہ نہیں تو کم از کم چھٹی لے کر گھر ہی بیٹھ جایا کرو۔ تمھارا یوں کھلے عام سڑکوں پر پھرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ میری سنو ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ گرمیوں میں کچھ یہی دن تھے۔ میری بڑی بچی اسکول سے لوٹی تو بہت روہانسی تھی۔ کریدنے پر پتہ چلا اس کی ایک سہیلی نے جو وادیِ سوات جا رہی تھی، طعنہ دیا کہ کیا تم لوگ نادار ہو، جو سال بھر اپنے ہی گھر میں رہتے ہو۔ صاحب! وہ دن ہے اور آج کا دن، میں تو ہر سال مئی جون میں چھٹی

* انکم بریکٹ ۔ مساوی آمدنی والوں کا طبقہ ۔

لے کر مع اہل وعیال "انڈر گراؤنڈ" ہو جاتا ہوں"۔ پھر انھوں نے کراچی کے اور بھی بہت سے زمیں دوز شرفاء کے نام بتلائے جو انہی کی طرح سال کے سال اپنی عزّت و ناموس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اپنا یہ وار کارگر ہوتا دیکھا تو "ناک آؤٹ" ضرب لگائی۔ فرمایا "تم جو ادھر دس سال سے رخصت پر نہیں گئے تو لوگوں کو خیال ہو چلا ہے کہ تم اس ڈر کے مارے نہیں کھسکتے کہ دفتر والوں کو کہیں یہ پتہ نہ چل جائے کہ تمہارے بغیر بھی بخوبی کام چل سکتا ہے"۔

قصّہ حاتم طائی میں ایک طلسماتی پہاڑ کا ذکر آتا ہے۔ کوہِ ندا اس کا نام ہے اور یہ نام یوں پڑا کہ قلّۂ کوہ سے ایک عجیب و غریب آواز آتی ہے کہ جس کسی کو یہ سنائی دے، وہ جس حالت میں، جہاں بھی ہو، بے اختیار اسی کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ پھر دنیا کی کوئی طاقت، کوئی رشتہ ناتا، کوئی بندھن اسے روک نہیں سکتا۔ اب لوگ اسے قصّہ کہانی سمجھ کر مسکرا دیتے ہیں، حالانکہ سُننے والوں نے سُنا ہے کہ ایسی آواز اب ہر سال ہر پہاڑ سے آنے لگی ہے۔ مرزا کا کہنا ہے کہ یہ آواز جب تمہیں پہلے پہل سُنائی دے تو اپنی مُفلسی کو اپنے اور پہاڑ کے درمیان حائل نہ ہونے دو۔ لہٰذا طے پایا کہ صحت اور غیرت کا یہی تقاضا ہے کہ ہل اسٹیشن چلا جائے۔ خواہ مزید قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ ہم نے دبے لہجے میں یاد دلایا کہ قرض مقراضِ محبّت ہے۔ مرزا بولے، دیکھتے نہیں، لوگ اس مقراض کو کیسی چابکدستی سے استعمال کر کے اپنی مشکلات دُوسروں کو منتقل کر دیتے ہیں؟ صاحب! ہنر مند کے ہاتھ میں اوزار بھی ہتھیار بن جاتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت غالباً بے محل نہ ہو گی کہ قرض کے باب میں مرزا کا پندرہ بیس سال سے وُہی عقیدہ ہے جو مولینا حالی کا علم و ہنر کے بارے میں تھا یعنی ہر طرح سے حاصل کرنا چاہیے

جس سے ملے، جہاں سے ملے، جس قدر ملے

لیکن ہم نے اتنی شرط ضرور لگا دی کہ پروفیسر قاضی عبدالقدوس ساتھ ہوں گے تو ذرا دل لگی رہے گی اور ضرغوص بھی ساتھ چلیں گے۔ بلکہ ہم سب انہی کی چمچاتی بیوک کار میں چلیں گے۔

پروفیسر قاضی عبدالقدوس ظریف نہ سہی، ظرافت کے مواقع ضرور فراہم کرتے رہتے ہیں۔ مگر انھیں ساتھ گھسیٹنے میں تفننِ طبع کے علاوہ ان کی دُنیا و عاقبت سنوارنے کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ وہ یوں کہ قصبہ چاکسُو سے کراچی وارد ہونے کے بعد وہ پندرہ سال سے ریل میں نہیں بیٹھے تھے اور اب یہ عالم ہو گیا تھا کہ کبھی میونسپل حدود سے باہر قدم پڑ جائے تو اپنے کو غریب الوطن محسُوس کرنے لگتے۔ آخر کس باپ کے بیٹے ہیں۔ ان کے والدِ بزرگوار رتے مرگئے، مگر فرنگی کی ریل میں نہیں بیٹھے اور آخر دم تک اس عقیدے پر بڑے استقلال سے قائم رہے کہ دُوسرے قصبوں میں چاند اتنا بڑا ہو ہی نہیں سکتا جتنا کہ چاکسُو میں۔ مناظرِ قدرت کے شیدائی ہیں، خصُوصًا دریائے سندھ کے۔ کہتے ہیں، خُدا کی قسم! اس سے خوبصورت دریا نہیں دیکھا۔ وہ قسم نہ کھائیں تب بھی یہ دعویٰ حرف بحرف صحیح ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے واقعی کوئی اور دریا نہیں دیکھا۔ خُدا جانے کب سے اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ بس ٹوکنے کی دیر تھی۔ کہنے لگے، ضرور چلوں گا۔ کراچی تو نِرا ریگستان ہے۔ بارش کا نام نہیں۔ دو سال سے کان پرنالے کی آواز کو ترس گئے ہیں۔ میں تو ساون بھادوں میں رات کو غسل خانے کا نل کھُلا چھوڑ کر سوتا ہوں تاکہ خواب میں ٹپ ٹپ کی آواز آتی رہے۔ مرزا نے ٹوکا کہ کوئٹہ میں بھی برسات میں بارش نہیں ہوتی۔ پُوچھا، کیا مطلب؟ بولے، جاڑے میں ہوتی ہے۔

تاہم "پاک بوہیمین کافی ہاؤس" میں کئی دن تک قیاس آرائیاں ہوتی رہیں کہ پروفیسر قدوس ساتھ چلنے کے لیے اتنی جلدی کیسے آمادہ ہو گئے اور کوئٹہ کا نام سُنتے ہی

ملتان کی کوری صراحی کی طرح کیوں سنسنانے لگے۔ مرزا نے کچھ اور ہی تاویل کی۔ فرمایا'
قصّہ دراصل یہ ہے کہ پروفیسر کے ایک دوست ان کے لیے پیرس سے سمور کے دستانے
تحفتہً لائے ہیں، جنھیں پہننے کے چاؤ میں وہ جلد از جلد کسی ہل اسٹیشن جانا چاہتے ہیں' کیونکہ
کراچی میں تو لوگ دسمبر میں بھی ململ کے کرتے پہن کر آئس کریم کھانے نکلتے ہیں۔ اس حسنِ
تعلیل کی تصدیق ایک حد تک اس سوٹ کیس سے بھی ہوتی جس میں پروفیسر یہ دستانے
رکھ کر لے گئے تھے۔ اس پر یورپ کے ہوٹلوں کے رنگ برنگے لیبل چپکے ہوئے تھے۔ وہ
اسے کبھی جھاڑتے پونچھتے نہیں تھے کہ کہیں وہ اتر نہ جائیں۔

اب رہے ضرغوص۔ تو رسمی تعارف کے لیے اتنا کافی ہوگا کہ پورا نام ضرغام
الاسلام صدّیقی ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی سینیر ایڈووکیٹ ہے۔ ہمارے یونیورسٹی کے ساتھی
ہیں۔ اُس زمانے میں لڑکے بربنائے اخلاص و اختصار انھیں "ضرغوص" کہتے تھے۔ ان
مخلص حلقوں میں آج بھی اسی مخفّف نام سے پکارے اور یاد کیے جاتے ہیں۔ اکثر ناواقف
اعتراض کر بیٹھتے ہیں، بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا۔ لیکن ایک دفعہ انھیں دیکھ لیں تو کہتے ہیں'
ٹھیک ہی ہے۔ پروفیسر نے ان کی شخصیّت کا تجزیہ بلکہ پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے ایک
دفعہ بڑے مزے کی بات کہی۔ فرمایا' ان کی شخصیّت میں سے "بنکٹ سلینس" اور "بیوک"
نکال دیں تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟ مرزا نے جھٹ سے لقمہ دیا' ایک بدنصیب بیوی ــــ!
سیر و سیاحت کے رسیا، لیکن ذرا کھرچ کر دیکھیے تو اندر سے ٹھیٹ شہری۔ ایسا شہری جو
بڑی محنت، بڑی مشقّت سے جنگلوں کو ختم کرکے شہر آباد کرتا ہے اور جب شہر آباد ہو جاتے ہیں
تو پھر جنگلوں کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ بڑے وضعدار آدمی ہیں اور اس قبیلے سے
ہیں جو پھانسی کے تختے پر چڑھنے سے پہلے اپنی ٹائی کی گرہ درست کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

زیادہ تر کار سے سفر کرتے ہیں اور اسے بھی کمرۂ عدالت تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ کراچی سے اگر کابل جانا ہو تو اپنے علاقے کے چوراہے سے ہی درۂ خیبر کا راستہ پوچھنے لگیں گے۔ دو سال پہلے مرزا ان کے ہمراہ مری اور وادیِ کاغان کی سیر کر آئے تھے اور ان کا بیان ہے کہ کراچی میونسپل کارپوریشن کے حدود سے نکلنے سے پہلے ہی وہ پاکستان کا "روڈ میپ" (سڑکوں کا نقشہ) سیٹ پر پھیلا کر بغور دیکھنے لگے۔ مرزا نے کہا تمہیں بغیر نقشہ دیکھے بھی یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کراچی سے نکلنے کی ایک ہی سڑک ہے۔ بقیہ تین طرف سمندر ہے۔ بولے اسی لیے تو سارا تردّد ہے۔

اسی سفر کی یادگار ایک تصویر تھی جو ضرغوص نے کوہِ شوگراں پر ایک پنشن یافتہ ٹٹو پر بحالتِ رکوع کھنچوائی تھی۔ اس تصویر میں وہ دُم کے علاوہ ٹٹو کی ہر چیز پر سوار نظر آتے تھے۔ لگام اتنے زور سے کھینچ رکھی تھی کہ ٹٹو کے کان ان کے کانوں کو چھو رہے تھے۔ اور چاروں کانوں کے بیچ میں ٹٹو کی گردن پر اُن کی سہ منزلہ ٹھوڑی کی قلم لگی ہوئی تھی۔ اپنا سارا وزن رکاب پر ڈالے ہوئے تھے تاکہ ٹٹو پر بوجھ نہ پڑے۔ مرزا کہتے ہیں کہ کھڑی چڑھائی کے دوران کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ٹٹو کمر لچکا کر رانوں کے نیچے سے سٹک گیا اور ضرغوص کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ دُشوار گزار ڈھلوانوں پر جہاں پگڈنڈی تنگ اور دائیں بائیں ہزاروں فٹ گہرے کھڈ ہوتے، وہاں وہ خود ٹانگیں سیدھی کر کے کھڑے رہ جاتے۔ کہتے تھے، اگر مقدر میں گر کر ہی مرنا لکھا ہے تو میں اپنی ٹانگوں کی لغزش سے مرنا پسند کروں گا، ٹٹو کی نہیں۔ یہ تصویر تین چار ہفتے تک ان کے دفتر میں "رش" لیتی رہی۔ بعد ازاں دُوسرے وکیلوں نے سمجھا بجھا کر اُتروا دی کہ انجمنِ انسدادِ بے رحمیِ جانوران والوں میں سے کسی نے دیکھ لی تو کھٹاک سے تمہارا چالان کر دیں گے۔

(۲)

چار درویشوں کا یہ قافلہ کار سے روانہ ہوا۔ ریگستان کا سفر اور لُو کا یہ عالم کہ پسینہ نکلنے سے پہلے خشک۔ اجیجب آباد سے آگے بڑھے تو مرزا کو بڑی شدت سے چینوں کی کمی محسوس ہونے لگی۔ اس لیے کہ اگر وہ پاس ہوتے تو ریت میں بڑے رخسنہ بھُونے جاسکتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد انھوں نے صُراحی میں پتّی ڈال کر چائے بنانے کی تجویز پیش کی جو بلا شکریہ اس لیے رد کر دی گئی کہ سڑک سے دھواں سا اُٹھ رہا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ضرغوص کو بھی گرم پانی گرم تر ٹائروں پر چھڑکنا پڑتا تھا۔ ۱۲۰ درجہ گرمی سے پگھلے ہوئے تارکول کی چھینٹیں اُڑ اُڑ کر کار کے شیشے کو داغدار کر رہی تھیں۔ اس چھلنی میں سے جھانکتے ہوئے ہم نے اُنگلی کے اشارے سے پروفیسر کو سات آٹھ سال کی بلوچ لڑکی دکھائی جو سر پر خالی گھڑا رکھے، سڑک پر ننگے پاؤں چلی جا رہی تھی۔ جیسے ہی اُس پر نظر پڑی، پروفیسر نے برف کی ڈلی جو وہ چُوس رہے تھے، فوراً تھوک دی۔ اس پر ضرغوص کہنے لگے کہ وہ ایک دفعہ جنوری میں کراچی سے برف باری کا منظر دیکھنے گئے تو مری کے نواح میں برف پر پیروں کے نشان نظر آئے، جن میں خون جما ہوا تھا۔ ہوٹل گائیڈ نے بتایا کہ یہ پہاڑیوں اور ان کے بچّوں کے پیروں کے نشان ہیں۔ پروفیسر کے چہرے پر درد کی لہر دیکھ کر ضرغوص تسلی دینے لگے کہ یہ لوگ تو "لینڈ اسکیپ" ہی کا حصّہ ہوتے ہیں۔ ان میں احساس نہیں ہوتا۔ پروفیسر نے کہا، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہارن بجاتے ہوئے بولے، احساس ہوتا تو ننگے پاؤں کیوں چلتے؟

راستے کی رُوداد جو راستے ہی کی طرح طویل اور دلچسپ ہے ہم علیحدہ رپورتاژ کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں کہ ہر سنگِ میل سے ایک یادگار حماقت وابستہ ہے۔ سرِ دست اتنا اشارہ کافی

ہو گا کہ پروفیسر اور مرزا کے لطفِ صحبت نے چھ سو میل کی مسافت اور تکان کو محسوس نہ ہونے دیا۔ پہاڑی راستوں کے اُتار چڑھاؤ پروفیسر کے لیے نئی چیز تھی۔ بطورِ خاص ہمیں مخاطب کرکے فرمایا، "واللہ! یہ سڑک تو ہارٹ اٹیک کے کارڈیو گرام کی مانند ہے!" ہر ناگہانی موڑ پر انھیں بیگم کی مانگ اُجڑتی دکھائی دیتی اور وہ مڑ مڑ کے سڑک کو دیکھتے جو پہاڑ کے گرد سانپ کی طرح لپٹتی، بل کھاتی چلی گئی تھی۔ صغرض نے کار کو ایک سُرنگ میں سے پرو کر نکالا تو مرزا انگریز انجنیئروں کو یاد کرکے ایک دم جذباتی ہو گئے۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر کہنے لگے، "یہ ہل اسٹیشن انگریز کی دین ہیں۔ یہ پہاڑ انگریز کی دریافت ہیں۔" پروفیسر قدوس نے دائیں کنپٹی کھجلاتے ہُوئے فوراً تردید کی۔ فرمایا، "تاریخ کہتی ہے کہ ان پہاڑوں پر انگریزوں سے پہلے بھی لوگ رہتے تھے۔" مرزا نے کہا، "بجا! مگر انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم پہاڑ پر رہ رہے ہیں!" بالآخر نوک جھوک اور پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہُوا اور سانپ کے پھن پر ایک ہیرا دمکتا ہُوا دکھائی دیا۔ "EUREKA ! EUREKA !"

شہر میں داخل ہوتے ہی ہم تو اپنے آپ کو مقامی آب وہوا کے سپرد کرکے بے غم ہو گئے، لیکن مرزا کی باچھیں کانوں تک کھل گئیں اور ایسی کھلیں کہ دہانے میں تربوز کی قاش فٹ آجائے۔ سڑک کے دونوں طرف دیو قامت چنار دیکھ کر انہی کی طرح جھومنے لگے۔ بولے، "اس کو کہتے ہیں عالم آرائی۔ ایک پیڑ کے نیچے پُوری برات سوجائے۔ یُوں ہونے کو لاہور میں بھی درخت ہیں۔ ایک سے ایک تناور، ایک سے ایک چھتنار۔ مگر جُون جولائی میں پتّا تک نہیں ہلتا۔ معلوم ہوتا ہے، سانس روکے فوٹو کھنچوانے کھڑے ہیں۔" ہم بڑھ کر بولے، "لیکن کراچی میں تو چوبیس گھنٹے فرحت بخش سمندری ہوا چلتی رہتی ہے۔" فرمایا، "ہاں! کراچی میں پیپل کا پتّا بھی ہلنے لگے تو ہم اسے یکے از عجائباتِ قدرت جان کر میونسپل کارپوریشن

کا شکر ادا کرتے ہیں، جس نے یہ بیل بوٹے اُگائے ہیں۔ مگر یہاں اس "نیچرل بیوٹی" کی داد دینے والا کوئی نہیں۔ ہائے! یہ منظر تو بالکل کرسمس کارڈ کی طرح ہے!

ہم تینوں "یہ کرسمس کارڈ" دیکھنے کے بجائے پروفیسر کو دیکھ رہے تھے اور وہ "زندہ" درختوں کو انگلیوں سے چھو چھو کر اپنی نظر کی تصدیق کر رہے تھے۔ دراصل وہ خوبانیوں کو پھل والوں کی دکانوں میں رنگین کاغذوں اور گوٹے کے تاروں سے سجا سجایا دیکھنے کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ اب کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ خوبانیاں درختوں میں بھی لگ سکتی ہیں۔

فاضل پروفیسر تادیر اس روح پرور منظر سے محظوظ ہوتے رہے بلکہ اس کے کچھ لذیذ حصے تناول بھی فرمائے۔

(۳)

پہلا مسئلہ رہائش کا تھا۔ اس کا انتخاب و انتظام پروفیسر کی ناقص رائے پر چھوڑ دیا گیا، مگر ان کی نظر میں کوئی ہوٹل نہیں جچتا تھا۔ ایک "الٹرا ماڈرن" ہوٹل کو اس لیے ناپسند کیا کہ اس کے غسل خانے بڑے کشادہ تھے، مگر کمرے موذی کی گور کی طرح تنگ۔ دوسرے ہوٹل کو اس لیے کہ وہاں معاملہ برعکس تھا اور تیسرے ہوٹل کو اس وجہ سے کہ وہاں دونوں چیزیں ایک ہی ڈیزائن پر بنائی گئی تھیں۔ یعنی ——— آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ چوتھے عالیشان ہوٹل سے اس بنا پر بھاگ لیے کہ بندہ کسی ایسے ہوٹل میں ٹھیرنے کا روادار نہیں، جہاں کے بیرے مسافروں سے زیادہ اسمارٹ ہوں۔ پھر کار پانچویں ہوٹل کے پورچ میں جا کر رکی، جہاں ایک سائن بورڈ دو دو فٹ لمبے حروف میں

دعوتِ طعام و قیام دے رہا تھا :

گھر کی سی غذا اور فضا

اب کی دفعہ مرزا بدک گئے۔ کہنے لگے "صاحب! میں ایک منٹ بھی ایسی جگہ نہیں رہ سکتا، جہاں پھر وہی ——"

جملہ مکمّل ہونے سے پہلے ہم اُن کا مطلب سمجھ کر آگے بڑھ گئے۔

چھٹا نمبر "جنتان" ہوٹل کا تھا۔ انگریزوں کے وقتوں کی یہ ترشی ترشائی سی عمارت سفیدے کے چکنے چکنے تنوں کی اوٹ سے یُوں جھلملا رہی تھی جیسے سالگرہ کا کیک —! دیکھتے ہی سب لوٹ ہو گئے۔ پروفیسر نے آگے بڑھ کر اُس کے از کار رفتہ اینگلو انڈین منیجر سے بعد مصافحہ کرایہ دریافت کیا۔ جواب ملا سنگل رُوم —— پچپن روپے یومیہ۔ ڈبل رُوم —— میاں بیوی کے لیے —— پچھتّر روپے۔ سب سنّاٹے میں آگئے۔ ذرا اوسان دُرست ہوئے تو مرزا نے سُوکھے منہ سے پُوچھا

"کیا اپنی ذاتی بیوی کے ساتھ بھی پچھتّر روپے ہوں گے؟"

یارے رہنے کا ٹھکانہ ہُوا تو سیر سپاٹے کی سُوجھی۔ پروفیسر کو کوئٹہ بحیثیت مجموعی بہت پسند آیا۔ یہ "بحیثیتِ مجموعی" کی نرخ ہماری نہیں، انھیں کی لگائی ہُوئی ہے۔ دِل ہی دِل میں تو وہ اس شہرِ نگاراں، اس سیرگاہِ مغروراں کی ایک ایک ادا، بلکہ ایک ایک اینٹ پر نثار تھے۔ لیکن محفل میں کُھل کر تعریف نہیں کرتے تھے، مبادا لوگ انھیں ٹورسٹ بیورو کا افسر سمجھنے لگیں۔ چار پانچ روز بعد ہم نے تخلیے میں پُوچھا، کہو، ہل اسٹیشن پسند آیا؟ بولے، ہاں! اگر یہ پہاڑ نہ ہوں تو جگہ اچھی ہے! پُوچھا، پہاڑوں سے کیا ہرج ہے؟ بولے، بقول مجاز دُوسری طرف کا منظر نظر نہیں آتا۔ دراصل انھیں بے برگ و گیاہ پہاڑ دیکھ کر قدرے مایُوسی ہوئی۔ چنانچہ

ایک دِن کہنے لگے :

"مرزا! یہ پہاڑ تمھارے سر کی طرح کیوں ہیں؟"

"ایک زمانے میں یہ بھی دیوداروں اور صنوبروں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ پربت پربت ہریالی ہی ہریالی تھی۔ مگر بکریاں سب چٹ کر گئیں۔ اسی لیے حکومت نے بکریوں کے استیصال کے لیے ایک محاذ بنایا ہے اور پوری قوم خنجر بکف حکومت کے ساتھ ہے"۔

"مگر ہمیں تو یہاں کہیں بکریاں نظر نہیں آئیں"

"انھیں یہاں کے باشندے چٹ کر گئے"

"لیکن مجھے تو گلی کوچوں میں یہاں کے اصلی باشندے بھی دکھائی نہیں دیتے"

"ہاں! وہ اب سبی* میں رہتے ہیں!"

ہم نے دونوں کو سمجھایا، آج درخت نہیں ہیں تو کیا۔ محکمہ جنگلات سلامت ہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔ ارشاد ہوا، صاحب! محکمہ جنگلات ہے تو ہوا کرے۔ "ان کلین شیو" پہاڑوں میں اُس کے غالباً وہی فرائض ہوں گے جو افغانستان میں بحری بیڑے کے۔

پروفیسر یہ سنگلاخ پہاڑ دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ ایسے مناظر "پہاڑ ہی پہاڑ جن میں پہاڑ کے علاوہ کچھ نہ ہو" دنیا میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ مرزا نے بہتیرا سمجھایا کہ پہاڑ اور ادھیڑ عورت دراصل آئل پینٹنگ کی طرح ہوتے ہیں ——— انھیں ذرا فاصلے سے دیکھنا چاہیے۔ مگر پروفیسر دُور کے جلوے کے قائل نہیں۔ بے شجر پہاڑوں سے ان کی بیزاری

---

* سبی : کوئٹہ سے کوئی سو میل دُور ایک انتہائی گرم (۱۲۰ — ۱۱۵ ڈگری) مقام جسے کوئٹہ کا دروازہ کہنا چاہیے، کیونکہ

ہر رہ جو اُدھر کو جاتی ہے سبی سے گزر کر جاتی ہے

کم کرنے کی غرض سے مرزا نے ایک دن غروب آفتاب کے وقت کوہِ مُردار کے سلسلے کی وُہ مشہور سُرمئی پہاڑی دکھائی، جس کے "سلوئٹ"* کو دیکھنے والا اگر نظر جما کر دیکھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک نازک اندام نازنیں مُردہ پڑی ہے۔ اس کے پیچھے کو پھیلے ہوئے بال، کُشادہ پیشانی، چہرے کا تیکھا تیکھا پروفائل اور سینے کے تکون غور سے دیکھنے پر ایک ایک کر کے اُبھرتے چلے جاتے ہیں۔ مرزا انگلی پکڑ کے پروفیسر کو اس تصویر کے ہجّے کراتے گئے۔ موصوف اپنی آنکھوں پر دائیں ہاتھ کا چھجّا بنا کر بغور دیکھتے رہے اور اس حسین و حزیں منظر سے نہ صرف متأثر ہُوئے بلکہ بعد معائنہ اعلان فرمایا کہ نازک اندام نازنیں مری نہیں، صرف بے ہوش ہے۔

پہاڑوں کی تہی دامنی سے گلہ دو دن بعد دُور ہوا جب سب منزلیں مارتے قائدِ اعظم کے محبوب ہل اسٹیشن زیارت (آٹھ ہزار فٹ) پہنچے۔ جہاں تک پروفیسر کی عینک کام کرتی تھی، ہرا ہی ہرا نظر آ رہا تھا۔ بستر بند کھلنے سے پہلے فاضل پروفیسر نے ایک پہاڑی سر کر ڈالی اور اس کی چوٹی پر پہنچ کر تصویریں بھی اُتروائیں، جن میں ان کے ہونٹوں پر وہ فاتحانہ مُسکراہٹ کھیل رہی تھی، جو نوابین و مہاراجگان کے چہروں پر مُردہ شیر کے سر پر رائفل کا کندا رکھ کر فوٹو کھنچواتے وقت ہوا کرتی تھی۔ وہ اس سرکش چوٹی کی بلندی آٹھ ہزار پچاس فٹ بتاتے تھے۔ اور اس میں قطعی مبالغہ نہ تھا۔ اس لیے کہ سطحِ سمندر سے اس کی بلندی اتنی ہی تھی، گو کہ زمین کی سطح سے صرف پچاس فٹ بلند ہو پائی تھی۔ جھوٹ سچ کا حال اللہ جانے، مگر مرزا کا حلفیہ بیان ہے کہ کوہِ مفتوحہ کی چوٹی پر قدم رکھنے کے پانچ منٹ بعد تک فاتح پروفیسر کے ہانپنے کی آواز پچاس فٹ نیچے "بیس کیمپ" میں صاف

---

* سلوئٹ: چہرے کے ایک رُخ کی آؤٹ لائن، جس میں سیاہ رنگ بھرا ہو۔

سُنائی دیتی تھی، جہاں ضرغوص خود ہی کیمرہ لیے شام کی نارنجی روشنی میں اس تاریخی منظر کو فلما رہے تھے۔ مذکورہ مہم کے آخری مراحل میں پروفیسر نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ایسے پہاڑوں پر حکومت بجلی کی لفٹ لگا دے تو ملک میں کوہ پیمائی کا شوق پیدا ہو جائے۔ اس آسانی پر مرزا نے طعنہ دیا کہ ہماری ہی قوم کا ایک فرد ظہیر الدین بابر کہ جس کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے یہ کوہ و دمن، یہ دشت و جبل کبھی گونجے تھے، دو قوی الجثہ مغل سپاہیوں کو بغل میں دبا کر قلعے کی فصیل پر بے تکان دوڑتا تھا۔ یہ سُنتے ہی پروفیسر چشمے کے پاس ستانے بیٹھ گئے۔ اس کے صاف شفاف پانی سے ہاتھ پاؤں دھوئے اور گلے میں لٹکی ہوئی چھاگل سے مری بئیر انڈیلتے ہوئے بولے، مگر ہماری تاریخ بابر پر ختم نہیں ہوتی سرکار! آپ یہ کیسے بھول گئے کہ واجد علی شاہ، تاجدارِ اودھ جب زینے پر لڑکھڑاتے ہوئے چڑھتے تو سہارے کے لیے (اُس زمانے میں لکڑی کی "ریلنگ" ایجاد نہیں ہوئی تھی) ہر سیڑھی پر جی ہاں! ہر سیڑھی پر دونوں طرف نوخیز کنیزیں کھڑی رہتی تھیں ——— مغلوں کی تلوار کی طرح خمیدہ و بے نیام!

پروفیسر نے جغرافیائی دُشواریوں پر اس طرح قابو پانے کے اور بھی کئی تاریخی طریقے بیان کیے۔ جن کے معتبر ہونے میں شُبہ ہو تو ہو، نُدرت میں کلام نہیں۔ لیکن چوٹی سر کرنے کے بعد جب وہ سنبھل سنبھل کر گھٹنیوں اُتر رہے تھے تو برابر کی چوٹی پر ایک مہیب پرچھائیں نظر آئی۔ پہاڑوں میں سورج جلد ہی ڈوب جاتا ہے اور اس وقت منظر کی جزئیات پر رات کا کاجل پھیلتا جا رہا تھا۔ سناٹا ایسا مکمل، ایسا شفاف اور آر پار کہ کلائی اپنے کان سے لگا کر سُنیں تو نبض کی دھک دھک صاف سُنائی دے۔ دفعتہً پُراسرار پرچھائیں نے حرکت کی۔ پروفیسر کے مُنہ سے بے اختیار ایک چیخ نکلی اور نکلتی چلی گئی۔ اور جب وہ نکل

چکی تو "ریچھ" کہہ کر وہیں سجدے میں چلے گئے۔ مرزا کو بھی ہدایت کی کہ جہاں ہو، وہیں بیٹھ جاؤ اور سگرٹ بجھا دو۔ مرزا پہلے ہی برفانی ریچھوں کے قصّے سُن چکے تھے۔ یُوں بھی سیدھے سادے مُسلمان ہیں، لہٰذا ہدایت پر آنکھ بند کر کے عمل کیا، بلکہ عمل کے بعد بھی آنکھ بند ہی رکھی۔ لیکن کچھ دیر بعد جی کڑا کر کے اُسے کھولا تو پُوچھنے لگے "مگر یہ میں میں کیوں کر رہا ہے؟" پروفیسر نے سجدے ہی میں ذرا دیر کان لگا کر سُنا اور پھر اُچھل کر کھڑے ہو گئے فرمایا "ارے صاحب! آواز پر نہ جائیے۔ یہ بڑا مکّار جانور ہوتا ہے!"

(۴)

ضرغوص جس اہتمام و انصرام سے سفر کرتے ہیں، وہ دیدنی ہے۔ محمّد شاہ رنگیلے کے متعلق تو سُنا ہی سُنا تھا کہ جب اس کی فوجِ ظفر موج نادر شاہ دُرّانی سے لڑنے نکلی تو جرنیل حسبِ مناصب چھوٹی، بڑی، منجھولی پالکیوں میں سوار احکام صادر کرتے جا رہے تھے اور آگے آگے خدمت گار اُن کی آبدار تلواریں اُٹھائے چل رہے تھے۔ من جملہ دیگر ساز و سامانِ حرب کے کئی چھکڑے مہندی سے لدے جلو میں تھے تاکہ سپاہی اور سپہ سالار اپنے ہاتھ پیروں اور بالوں کو رَن میں جانے سے پہلے شاہ پسند رنگ میں رنگ سکیں۔ مرزا سے روایت ہے کہ سفر تو خیر سفر ہے۔ ضرغوص شہر میں بھی اتنی وضعداری برتتے ہیں کہ ان کا بڑا لڑکا کرکٹ کھیلتا ہے تو چپراسی چھتری لگائے ساتھ ساتھ دوڑتا ہے۔ غالبؔ کی طرح ضرغوص تیغ و کفن ہی نہیں، تختۂ غسل اور کافور تک باندھ کر لے جانے والوں میں سے ہیں۔ لحاف اور ململ کا کُرتا، نمک اور کوکا کولا، تاش اور کیسانوا (اُن کا سیاہ کتّا)، ڈنر جیکٹ اور "پک وِک پیپرز"، بندوق اور فرسٹ ایڈ کا بڑا بکس۔

غرضیکہ کونسی غیر ضروری چیز ہے جو دورانِ سفر اُن کی زنبیل میں نہیں ہوتی ؟ البتہ اس مرتبہ واپسی پر انھیں یہ قلق رہا کہ سفر یُوں تو ہر لحاظ سے کامیاب رہا، مگر فرسٹ ایڈ کا سامان استعمال کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا۔

ان کے اندر جو شہری بسا ہُوا ہے، وہ کسی طرح اور کسی لمحے ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کبھی بادام کے تنے پر چاقو کی نوک سے اپنا نام اور تاریخِ آمد لکھواتا ہے اور کبھی پہاڑی چکور کے شوخ رنگوں کی داد بائیس بور کی گولی سے دیتا ہے۔ کبھی گونجتے گرجتے آبشاروں کے دامن میں "راک اینڈ رول" اور "ٹوئسٹ" کے ریکارڈ بجا کر سیٹیوں سے سنگت کرتا ہے اور کبھی جنگلوں کی سیر کو یُوں نکلتا ہے گویا "ایلفی"* یا "مال" پر شام کے شکار کو نکلا ہے۔ مرزا نے بارہا سمجھایا، دیکھو! پہاڑوں، جنگلوں اور دیہاتوں میں جانا ہو تو یُوں نہ نکلا کرو۔ یوڈی کلون لگائے، سگار منہ میں، ہر سانس بسر میں بسا ہُوا، باتوں میں ڈرائنگ روم کی مہک ــــ اِس سے دیہات کی بھینی بھینی خوشبوئیں دب جاتی ہیں۔ وہ سہمی سہمی خوشبوئیں جو یاد دِلاتی ہیں کہ یہاں سے دیہات کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ وہ سرحد جہاں سدا خوشبوؤں کی دھنک نکلی رہتی ہے ــــ کچّے دُودھ اور تازہ کٹی ہُوئی گھاس کی میٹھی میٹھی باس، چھپروں، کھپریلوں سے چھَن چھَن کر نکلتا ہُوا اُپلوں کا کڑوا کڑوا دُھواں، گھُمر گھُمر چلتی چکّی سے پھسلتے ہُوئے مکّی کے آٹے کی گرم گرم سگند کے ساتھ "وہ کنوار پتے کی تیز مہک"، جو ہڑ کی کائی کا بھیگا چھپلاندا جھونکا، سرسوں کی بالیوں کی کٹیلی مہکار، بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کا بھبکا، انگاروں پر سنکتی ہُوئی روٹی کی سیدھی معدے میں گھُس جانے والی لپیٹ اور ان سب میں رچی ہُوئی، ان سب میں گھُلی ہُوئی کھیتوں اور کھلیانوں میں تانبا سے تپتے ہُوئے جسموں

* ایلفی : ایلفنسٹن اسٹریٹ، کراچی

کی ہزاروں سال پُرانی مہک ـــــ یہ زمین کے وحشی سانس کی خوشبو ہے۔ زمین کو سانس لینے دو۔ اس کی خوشبو کے سوتے خون سے جا ملتے ہیں۔ اسے مساموں میں سہج سہج جذب ہونے دو۔ اسے ہوانا سگار اور "ڈیوڈورنٹ"* سے نہ مارو کہ یہ ایک دفعہ جس بستی سے رُوٹھ جاتی ہے، پھر لَوٹ کر نہیں آتی۔ تُم نے دیکھا ہوگا، چھوٹے بچّوں کے جسم سے ایک پُراسرار مہک آتی ہے۔ کچّی کچّی، کوری کوری، جو بڑے ہو کر اچانک غائب ہو جاتی ہے۔ یہی حال بستیوں کا ہے۔ شہر اب بُوڑھے ہو چکے ہیں۔ اُن میں اپنی کوئی خوشبو باقی نہیں رہی۔

پروفیسر قدوس کو ایسی باتوں میں "لادے اِک جنگل مجھے بازار سے" والا فلسفہ نظر آتا ہے۔ جو سفید کالر والوں کی خوشبودار فراریت کی پیدا وار ہے۔ کہتے ہیں شہری غزالوں کا نافہ اُن کے سر میں ہوتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بحث میں چاروں طرف سے شہ پڑنے لگے تو وہ مرزا ہی کے کسی نیم فلسفیانہ فقرے کی فصیلوں کے پیچھے دبک جاتے ہیں اور اس لحاظ سے اُن کا رویّہ ٹھیٹ پروفیسرانہ ہوتا ہے۔ یعنی اصل متن کے بجائے محض فٹ نوٹ پڑھنا کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ لیکن ضرغوص کا عمل صحت مندانہ نہ سہی، صحّت افزا ضرور ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ وہ مناظرِ قدرت کی داد اپنے معدے سے دیتے ہیں۔ جہاں موسم خوشگوار اور منظر خوش آئند ہُوا، اور ان کی سمجھ میں اس سے لطف اندوز ہونے کا ایک یہی طریقہ آیا کہ ڈٹ کر کھایا جائے اور بار بار کھایا جائے۔ اور اس خوشگوار شغل سے جو تھوڑا سا وقت بچ رہے، اس میں رمی کھیلی جائے۔ یہاں بدقسمتی سے موسم ہمیشہ اچّھا رہتا تھا۔ اِس لیے روزانہ کھانے کے درمیانی وقفوں میں رمی کی بازی جمتی۔ مخلص دوستوں نے اِس طرح پُورے چھ ہفتے ایک دُوسرے کو کنگال بنانے کی مخلصانہ کوششوں میں گُزار دیے۔

* ڈیوڈورنٹ : قُدرتی بُو کو زائل کرنے والی دوائیں۔

ضرغوص تو آنکھ بچا کر پیتا بدلنے میں بھی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ اس لیے کہ یہ نہ کریں تب بھی پروفیسر ہر جیتنے والے کو بے ایمان سمجھتے ہیں۔ بہر صورت ہم نے تو یہ دیکھا کہ اُن گنت شاداب لمحے، جو چیڑ اور چنار کے نظارے میں صرف ہو سکتے تھے، وہ دونوں نے چڑیا کے غلام اور پان کے چوّے پر نظریں جمائے گزار دیے اور کبھی پلٹ کر پُرہیبت پہاڑوں پر ڈوبتے سورج اور چڑھتے چاند کا جلال نہیں دیکھا اور نہ کبھی آنکھ اٹھا کر اس رُوپ نگر کی آن دیکھی، جس کے سر سے زلزلے کی قیامت گزر گئی، مگر جہاں آج بھی گلاب دہکتے ہیں۔ رہگزار دں پہ بھی اور رُخساروں پر بھی۔ ان کی کنپٹیوں پر اب رُوپہلی تار جھلملانے لگے ہیں، مگر وہ ابھی اس لذتِ آوارگی سے آشنا نہیں ہوئے جو ایک پل میں ایک جگ کا رس بھر دیتی ہے۔ ابھی انھوں نے ہر پھول، ہر چہرے کو یُوں جی بھر کے دیکھنا نہیں سیکھا، جیسے آخری بار دیکھ رہے ہوں، پھر دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ ایسے ہی کوہساروں اور وادیوں سے گزرتے ہوئے بابر نے اپنی تزک میں کتنی مایوسی کے ساتھ لکھا ہے کہ جب ہم کسی دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالتے ہیں تو ہم اور ہماری مغل فوج اپنے خیموں کا رُخ دریا کے دلکش منظر کی طرف رکھتے ہیں، لیکن ہماری ہندی فوج اپنے خیموں کی پیٹھ دریا کی طرف کر لیتی ہے۔

یہاں ضرغوص کی کم نگہی دکھانی مقصود نہیں۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ کراچی پہنچ کر انھوں نے اپنی کھینچی ہوئی رنگین فلمیں اسکرین پر دیکھیں تو دنگ رہ گئے۔ کہنے لگے، یار! کمال ہے! ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئٹہ خوبصورت جگہ ہے!

(۵)

ضرغوص خود کو ہیون سانگ اور ایڈمنڈ ہلیری سے کم نہیں سمجھتے۔ بایں ہمہ جاتے

سیاحی کیفیت یہ ہے کہ ایک دن مرزا نے پوچھا، بار! کن چن چنگا بھی دیکھی؟ ارشاد ہوا نہیں۔ ہم چینی فلمیں نہیں دیکھتے۔ مگر کون سی فلم میں کام کر رہی ہے؟ مرزا بھی ان کے ہمراہ دوسری مرتبہ اپنا ملک دریافت کرنے نکلے تھے، مگر جہاں گئے، جدھر گئے، خود ہی کو مقابل پایا۔ آخر دو مہینے جغرافیہ میں سوانح عمری کا رنگ بھر کے لوٹ آئے۔ کہنا پڑے گا کہ ایک کا دل اور دوسرے کی آنکھیں شہری ہیں اور اس کی تصدیق قدم قدم پر پچھلے سفر کی رُوداد سے ہوتی ہے۔ آپ بھی سُنیے، کبھی ان کی، کبھی اُن کی زبانی۔ ضرغوص کا بیان ہے کہ تیورس کے سال مرزا وادیِ کاغان میں گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر فیروزی رنگ کی منجمد جھیل، میلوں تک پھیلے ہوئے گلیشیر اور برفپوش پہاڑ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ملائی کی برف کے علاوہ بھی کوئی برف ہو سکتی ہے اور وہ بھی مفت! کم و بیش اتنی ہی شدت کا عالمِ جذب دریائے کنہار دیکھ کر انھوں نے اپنے اوپر طاری کر لیا۔ اس تلملاتی، جھاگ اڑاتی، کوہستانی ندی کے پل پر دیر تک دم سادھے دریائے حیرت میں غوطہ زن رہے۔ آخر ایک دُرِ خوش آب لے کر اُبھرے۔ فرمایا، کس قدر خوبصورت جھاگ ہیں! بالکل لکس صابن جیسے! حاضرین نے اس اشتہاری تشبیہہ کا مذاق اُڑایا تو تنک کر بولے، صاحب! میں تو جب جانوں کہ ورڈزورتھ کو درمیان میں لائے بغیر آپ نیچر پر دو جملے بول کر دکھا دیں۔

مرزا بطور جوابِ آں غزل، اسی مقام اور اسی گھڑی کا ایک اور سماں کھینچتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ مردانِ خوش اوقات کس کس طرح مناظرِ قدرت کی منزلت بڑھاتے ہیں۔ (تصویر میں جگہ جگہ ضرغوص نے بھی شوخ رنگ لگا دیے ہیں۔) یہ مقام بالاکوٹ کے دامن میں اس کنارے پر واقع ہے، جہاں ندی دو بھاری پہاڑوں کے درمیان نرتکی کی

کمر کی طرح بل کھا گئی ہے۔ اس سے یہ کرامت منسوب ہے کہ جہانگیر کے ہمراہ اس راستے سے کشمیر جاتے ہوئے نور جہاں کی آنکھوں میں سوزش ہوئی۔ جہانگیر کو رات بھر نیند نہ آئی۔ شاہی طبیب کے سُرمہ و کحل و ضماد سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ ناگاہ ایک درویش باصفا کا اِدھر سے گزر ہوا۔ اُس نے کہا جیسے ہی چاند اس صنوبر کے اُوپر آئے، ملکہ ندی کا پانی انجل میں بھر کے اس میں اپنا چہرہ دیکھے اور اسی سے سات دفعہ آنکھیں دھوئے مولا اپنا فضل کرے گا۔ نور جہاں نے ایسا ہی کیا اور بار اسی آنکھیں ہو گئیں۔ اُس دِن سے اس مقام کا نام نین سُکھ ہو گیا اور اِدھر سے گزرتے ہوئے آج بھی بہت سے ہاتھ موتی سا پانی چلّو میں بھر کے اس البیلی ملکہ کی یاد تازہ کر جاتے ہیں۔

ہاں! تو یہ مقام تھا اور شروع برسات کی رات! صبح اسی جگہ ایک تاریخی فلم کی شوٹنگ کے دوران ہیروئن کے پیر میں موچ آگئی تھی اور چراغ جلے تک وادی بالاکوٹ کا ہر وہ باشندہ جو اُس دن صاحبِ فراش نہیں تھا، اس گھوڑے کو دیکھنے آیا، جس سے ہیروئن گری یا گرائی گئی تھی اور اس وقت جب رات کی جوانی ابھی نہیں ڈھلی تھی، یہاں اسی فلم کے پروڈیوسر (جن کا مقدمہ مجسٹریٹی سے سشن جج اور سشن جج سے ہائی کورٹ اور ہائی کورٹ سے سپریم کورٹ تک ضرغوص نے بلا محنتانہ و محنت لڑا اور ہارا تھا) ضرغوص کی خاطر تواضع میں بچھے جا رہے تھے۔ ساتھ شہد جیسی رنگت کے بالوں والی ہیروئن بھی تھی، جو ٹرانزسٹر ریڈیو پر "چا چا چا" کی دھن پر بیٹھے ہی بیٹھے اپنی غیر ماؤف ٹانگ تھرکا رہی تھی اور مرزا کے الفاظ میں "اوپن ایئر ہوسٹس" کے فرائض بڑی تن دہی سے انجام دے رہی تھی۔ ضرغوص فیروزے کی انگوٹھی سے "پک وک پیپرز" کی جلد پر تال دے رہے تھے۔ ریڈیو پر کوئی گرم گیت آتا تو سب کے سب سُر ملا کر اتنے زور سے ڈکرانے لگتے کہ اصل گانا

ذرا سُنائی نہ دیتا۔ صرف ناپسندیدہ گلنے خاموشی اور توجّہ سے سُنے گئے۔ البتہ مرزا شام ہی سے بوجہ سنجیدگی و سردی خاموش تھے۔ انھیں جب زیادہ سردی محسوس ہونے لگتی تو بے اختیار ان مہیب مشعلوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتے، جو بیس میل دُور پہاڑوں پر ایک مہینے سے رات ہوتے ہی روشن ہو جاتی تھیں۔ ایک مہینے سے کاغان کے جنگل دھڑ دھڑ جل رہے تھے اور دور دور سے سیّاح صنوبروں کی آگ دیکھنے لائے جا رہے تھے۔ لیکن یہاں چاروں طرف تہ در تہ تاریکی تھی، جس میں پہاڑی جگنو جا بجا مُسلمانوں کی اُمّیدوں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ مرزا نظریں نیچی کیے رس بھری گنڈیریاں چُوستے رہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ضرغوص اپنی کار کی ہیڈ لائٹ جلا دیتے اور سانولی رات اپنے راز سپُرد کر کے چند قدم پیچھے ہٹ جاتی۔ اُن کے سونے کے دانت سے شعاعیں پھُوٹنے لگتیں اور کیسانو وا کی شب تاب آنکھوں کے چراغ جل اُٹھتے۔ کچھ اور پیکر بھی جنھیں روشنی نے رات کی چٹان چیر کر تراشا تھا، نظر کے سامنے کوندجاتے

چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

اِس کوندے میں ندی جھما جھم کرنے لگتی۔ جیسے ٹشو کی ساری۔ (معاف کیجیے، یہ تیر بھی اسی ترکش کا ہے۔)

سامنے مرزا خاموش زانوئے تلمذ تہ کیے بیٹھے تھے۔ کچھ برفانی ہوا، کچھ گنڈیری کا اثر۔ اُن کا ہاتھ اپنی ناک پر پڑا تو ایسا لگا جیسے کسی دُوسرے کی ہے۔ پھر ندی کے پانی میں ہاتھ ڈالا تو محسوس ہوا، گویا پگھلی ہوئی برف ہے! اور یہ اس لیے محسوس ہوا کہ وہ واقعی پگھلی ہوئی برف تھی، جس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے بلیک اینڈ وہائٹ کی دُوسری بوتل کی گردن مرزا کی ٹائی سے باندھ کر ندی میں ڈال دی گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے پروڈیوسر

صاحب کو ایک شمپین گلاس کے کنارے پر لپ اسٹک کا گمان گزرا تو اتنا حصّہ اپنے دانتوں سے توڑ کر کٹر کٹر چبانے لگے اور اب وہ اندھیرے میں سگرٹ کا کش لیتے تو دہانے کے دونوں کونوں پر جیتے جیتے خُون کی دھاریں چمک اُٹھتی تھیں۔ گنڈیریوں سے فارغ ہو کر مرزا اِس منظر کو آنکھوں سے پیے جا رہے تھے، جن میں اب گلابی ڈورے اُبھر آئے تھے، جو غالباً نیند کے ہوں گے۔ اس لیے کہ گنڈیری میں اگر نشہ ہوتا تو مولوی گنّے لے کر گنڈیری کھلانے والوں کے پیچھے پڑ جاتے۔ اُن کے طَور بے طَور ہوتے دیکھے تو ضرغوص نے شانے جھنجھوڑ کر پُوچھا، مرزا! تم نے کبھی وہسکی پی ہے؟ خمار آلُود آنکھیں کھولتے ہوئے بولے، پی تو نہیں، مگر بوتل سے ایسی بو آتی ہے، جیسی ان کے مُنہ سے۔ بالکل ٹنکچر آئیڈین جیسی۔ یہ کہہ کر تصدیق طلب نظروں سے پروڈیوسر کو دیکھنے لگے، جو اس ٹنکچر آئیڈین سے اپنے منہ اور دل کے زخموں کو ڈِس انفکٹ کر رہے تھے۔ یہ شغل اس وقت تک جاری رہا، جب تک نہ پینے والوں نے نیند سے بے حال ہو کر اول فول بکنا شروع نہ کر دیا اور اَواخرِ ماہ کی چاندنی میں فرازِ بالاکوٹ پر اس مقبرے کے خطوط دمکنے لگے، جہاں سَوا سَو سال پہلے اِسی وادی، اِسی رُت اور اُترتے چاند کی انہی تاریخوں میں ایک جیالے★ نے اپنے خُون سے اپنی قوم کے داغوں کو دھویا تھا اور جہاں آج بھی خُدا کے سادہ دل بندے نسوار کی نذر چڑھا کر مُرادیں مانگتے نظر آجاتے ہیں۔

(۶)

بات ایک پہاڑ سے دُوسرے پہاڑ جا پہنچی۔ دکھانا صرف یہ تھا کہ پہاڑ پر زندگی

★ حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

ہر ڈھنگ اور ہر ڈھب سے گزاری جا سکتی ہے۔ ہنس کر، رو کر یا اکثریت کی طرح سو کر۔ مرزا کسی گھر بند نہیں۔ کچھ نہیں تو چوری چوری بیگم ضرغوص کے محبت اور املا کی غلطیوں سے بھرے ہوئے خط ہی پڑھتے رہتے۔ مگر ایک دن ایک عجیب رنگ میں پائے، بلکہ پکڑے گئے۔ دیکھا کہ مختلف رنگوں اور خوشبوؤں کے ٹوتھ پیسٹ سے کیرم بورڈ پر کچھ پینٹ کر رہے ہیں۔ خیر، ٹوتھ پیسٹ کے استعمال پر تو ہمیں کوئی اچنبھا نہیں ہوا۔ اس لیے کہ سُن چکے تھے کہ ابسٹریکٹ آرٹسٹ (تجریدی مصور) تصویر پر نیل پالش اور فنائل تک لگانے سے نہیں چوکتے اور ایک صاحب ایسے بھی گزرے ہیں، جنھوں نے کینوس پر گھوڑے کا نعل، اپنے کٹے ہوئے ناخن اور اکلوتی پتلون کے ساتوں بٹن ماڈل کی چوسی ہوئی گم سے چپکا کر بغدادی جم خانہ پرائز حاصل کیا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ کہ آرٹسٹوں کی صحبت میں رہتے رہتے ہم ایسی باتوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ ٹھٹھیرے کا کبوتر تالیوں سے نہیں اُڑتا۔ لیکن اس وقت پریشانی جو ہوئی تو اس بات سے کہ ہماری رسمی تعریف کو سچ سمجھ کر وہ ہمیں سے اس خوش ذائقہ تصویر کا عنوان پوچھنے لگے۔

"عنوان میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز تو تصویر ہوتی ہے 'تصویر!' " ہم نے ٹالنا چاہا۔

"پھر بھی۔ کیا نظر آتا ہے تمھیں؟" وہ بھلا چھوڑنے والے تھے۔

"نظر تو آتا ہے، مگر سمجھ میں نہیں آتا۔"

"پکاسو سے بھی کسی نے کہا تھا کہ صاحب! آپ کی تصویریں سمجھ میں نہیں آتیں۔ اُس نے بڑا پیارا جواب دیا۔ کہنے لگا، چینی زبان آپ کی سمجھ میں نہیں آتی، مگر پچاس کروڑ آدمی اسے بولتے ہیں۔ کیا سمجھے؟"

”لیکن یہ تصویر تو پکاسو کی بھی سمجھ میں نہیں آسکتی“ ہم نے کہا۔

”بلا سے نہ آئے۔ ایک رقاصہ اپنے حسن و کمال کی داد لینے دوسری رقاصہ کے پاس نہیں جاتی۔ داد تو تماشائیوں سے ملتی ہے“ مرزا نے کہا۔

انھوں نے بقول شخصے حاتم بالا کی بات کو بالاخانے تک پہنچا کر لیا۔

چرغوص کی طرح مرزا بھی ہل اسٹیشن کو ایک پیدائشی شہری کی پیار بھری نظر سے دیکھتے ہیں اور نظر بھی ایسے شہری کی، جس کی ولادت اور پہلی علالت کی تاریخ ایک ہی ہو۔ خیر مرزا تو ہمارے ہم جلیس و دمساز ٹھہرے، جن کے رگ و ریشے سے ہم اس طرح واقف ہیں جیسے اپنی ہتھیلی سے۔ لیکن اس دفعہ ہمیں چرغوص اور ہل اسٹیشن دونوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ خدا اگر آنکھیں دے تو انھیں استعمال کرنے کے مواقع بھی دے۔ ورنہ حیف ہے ایسی زندگی پر۔ لیکن ہل اسٹیشن پر ------ خواہ وہ مری ہو یا مسوری، اوٹاکمنڈ ہو یا کوئٹہ ------ زندگی ہماری آپ کی طرح بے مقصد نہیں ہوتی۔ اس کا ایک مقصد، ایک مطمحِ نظر ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ سہانی سڑکوں پر وہ فیشن پریڈ دیکھی جائے، جس میں ہر سال آسودہ حال گھرانوں کی ناآسودہ بیٹیاں دھن اور تن کی بازی لگا دیتی ہیں۔ انھی سڑکوں پر کالی کافی اور آلو کی ہوائیوں پر گزارہ کرنے والے ادیب بگیاتی زبان میں ایک دوسرے کو خونیں انقلاب پر اکساتے ہیں۔ انھی سڑکوں پر اپنے گلدان میں برگد اُگانے والے انٹلکچوئل کسی خوبصورت لڑکی کو شرفِ تذکرہ بخشنے کی گھات میں لگے رہتے ہیں۔ ادھر خوبصورت لڑکی چراغِ رخِ زیبا لیے اس [illegible] سرگرداں کہ جلد از جلد کسی بوڑھے لکھ پتی کی بیوہ بن جائے! یہ سوئمبر یہ سہاگ رت ہر سال منائی جاتی ہے اور اس سے پہلے کہ سبزۂ نورستہ برف کا کفن پہن کر سو جائے

چناروں کی آگ سرد اور قہوہ خانے ویران ہو جائیں۔ مویشی میدانوں میں اُترنے لگیں اور سڑکوں پر کوئی ذی رُوح نظر نہ آئے، بجز ٹورسٹ کے ——— اس سے پہلے کہ موسمِ گُل بیت جائے، بہت سے ہاتھوں کی تیسری اُنگلی میں انگوٹھیاں جگمگانے لگتی ہیں۔ اگرچہ عمرِ عزیز کے سہرے کے پھول دو دفعہ کھلنا کیا، مُرجھا چکے ہیں، مگر اب بھی سڑک پر ڈھیر سارے حسین چہرے دیکھ کر اُن کا حال ایسا ہوتا ہے، جیسا کھلونوں کی دُکان میں یتیم بچّے کا!

اس سوئمبر کے پہلو بہ پہلو ہِل اسٹیشن پر سارے ملک کے لاعلاج رُؤسا اور متموّل لاولدوں کا عظیم الشان سالانہ میلہ لگتا ہے، جس میں وسیع پیمانے پر تبادلۂ امراض ہوتا ہے۔ آپ نے شاید سُنا ہو کہ بنارس میں جو اپنی صبح اور ساڑیوں کے باوجود ایک پوِتر استھان کی حیثیت سے بھی مشہور ہے، سارے ہندوستان کے ضعیف الاعتقاد بوڑھے مرنے کے لیے کھنچ کر آتے ہیں اور بہت جلد دلی مُراد پاتے ہیں۔ جو بیمار اپنی قوتِ ارادی کی کمزوری کے سبب خود کو مرنے کے لیے تیار نہیں کر پاتے، وہ قریب ترین ہِل اسٹیشن کا رُخ کرتے ہیں۔ ہمارے مرزا صاحب کا ثانی الذکر (بیمار برادری) سے کتنا دیرینہ تعلق ہے اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ بیس برس پہلے آئی۔سی۔ایس کے مقابلے کے امتحان میں اوّل آنے کے بعد اُن کا ڈاکٹری معائنہ ہوا تو پتہ چلا کہ دانتوں کے علاوہ اور کوئی چیز ٹھیک نہیں۔ گو کہ برادری کے رُکن کی حیثیت سے ہم خود بھی اپنی صحت کی طرف سے ایک لمحہ غافل نہیں، تاہم ابھی یہ نوبت نہیں آئی کہ وٹامن کی گولی حلق سے اُترتے ہی اپنے بازو کی مچھلیاں پھُلا پھُلا کر دیکھنے لگیں۔ لیکن مرزا کا یہ روزمرہ کا معمول ہے کہ کھانا دانتوں ہی سے ہضم کرنے کے لیے شام کو ملنگے تلنگے کی چھڑی گھماتے ہوئے نکل جاتے۔ دستانوں کی طرح یہ سنڈل چھڑی بھی پروفیسر کے دوست پیرس سے لائے تھے۔ اس

پر فرینچ ایکٹرس برزیت باردو کی ٹانگ کا بالائی حصہ بطور دستہ لگا ہوا تھا۔ اسی کے سہارے پروفیسر نے وہ ٹیلا "فتح" کیا، جس کی سرکوبی کا مفصل حال پہلے آچکا ہے۔ اسی کے ذریعے وہ اندھیری راتوں میں اپنے اور گستاخ کتوں کے درمیان ایک باوقار فاصلہ قائم رکھتے ہیں اور اب اسی کو ہلاتے سہلاتے ہوئے مرزا جناح روڈ کی ہر تیسری دکان میں (جو دواؤں کی ہوتی تھی) دھڑانہ گھستے چلے جاتے۔ کاؤنٹر کے پاس استادہ مشین میں کھوٹی اکنی ڈال کر اپنا وزن لیتے اور اونس دو اونس کے اضافے پر مقامی آب وہوا کی شان میں قصیدے پڑھتے لوٹتے۔ ایک دن ہم نے کہا، دیکھو، دواؤں کی یہ دکان کتنی چلتی ہے۔ صبح سے رات گئے تک خوش پوش خواتین کا تانتا بندھا رہتا ہے، مگر تمھیں یہاں تلتے کبھی نہیں دیکھا۔ کہنے لگے، توبہ کیجیے صاحب! معلوم ہوتا ہے اس کی مشین خاص طور پر عورتوں کے لیے بنوائی گئی ہے۔ ایک دن تلا تو کل چالیس پونڈ اترا۔ دھک سے رہ گیا۔ سیٹھ سے جا کر شکایت کی "یہ کیا زیادتی ہے؟" خدا کی قسم کھل کے بولا "آپ کے ساتھ دشمنی تھوڑا ہی ہے۔ سبھی کو پچاس پونڈ کم بتاتی ہے!" اس سانحہ کے بعد اس بے ایمان کھوٹی اکنیوں کی ڈھیری میں سے مرزا کو ایک اکنی واپس کرنی چاہی، جسے انھوں نے ازراہِ اخلاق قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

بھلا مرزا ایسی دکان میں جا کر سیروں بلکہ منوں مایوسیاں کیوں مول لینے لگے وہ تو ان صحت پسندوں میں سے ہیں، جو ٹہلنے نکلیں تو قدموں کی گنتی رکھتے ہیں اور منہ تک لقمہ لینے سے پہلے اس خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لگا لیتے ہیں جو اس سے بننا چاہیے ـــــ مگر نہیں بنتا! ان کے تغذیاتی پیمانے کی رو سے کالے ہرن کی کلیجی میں ایک سالم اونٹ کی غذائیت ہوتی ہے۔ اور ایک پہاڑی چکور میں ہرن کے برابر۔ لیکن

کوئٹہ کی ایک خوبانی پورے تین چکوروں کے برابر ہوتی ہے۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ ایک دن اپنے حسابوں ڈیڑھ دو درجن سالم اونٹ درخت سے توڑ کر کچر کچر کھاتے اور جھومتے جھامتے ہمارے پاس آئے۔ کہنے لگے، صاحب! یہ شہر تو اس قدر پُر فضا ہے کہ کھا کھا کے پیٹ تو دیوالہ نکلا جا رہا ہے۔ کھانا حلق سے اترا نہیں کہ ہضم۔ ہم نے کہا، اس سے فائدہ؟ [illegible] دیکھتے نہیں؟ ٹورسٹ لوگ یہاں بے کاری سے بچنے کے لیے دن بھر جو سوئٹر [illegible] رہتی ہیں وہ تیار ہونے سے پہلے تنگ ہو جاتے ہیں۔ شام کو چلتے اور [illegible] کے ساتھ طبیعت بڑا مزا دیتی ہے۔ پھر ہر چیز ارزاں، ہر چیز خالص۔ حد یہ کہ [illegible] میں بھی [illegible] کی ملاوٹ نہیں۔ کراچی میں خالص دودھ تو بڑی بات ہے پانی بھی خالص نہیں ملتا۔ اس میں بھی دودھ کی آمیزش ہوتی ہے۔ مگر یہاں دکاندار [illegible] سستا بیچتے ہیں۔ اسی لیے بعض ٹورسٹ سمجھتے ہیں کہ چھوٹا شہر ہے [illegible] کوئٹہ کی فوقیت [illegible] دنیا کے دوسرے شہروں پر ثابت کرنے لگے۔

"[illegible] ہے؟"

"[illegible] اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، ستمبر کے مہینے ہمیشہ کے لیے خارج کر دیے جائیں تو واللہ! لاہور کا جواب نہیں!"

"[illegible]؟"

"[illegible] قبرستان! زمین کے نیچے کی آبادی، اوپر کی آبادی سے کہیں زیادہ [illegible] کھنڈر، سو اُن میں چمگادڑیں اور امریکی ٹورسٹ بسیرا کرتے [illegible] کھنڈر [illegible] کہا تھا کہ روم کی مثال ایک ایسے شخص کی سی ہے جو [illegible]

اپنی نانی کی لاش کی نمائش کر کے روزی کماتا ہے۔"

"مری، ملکۂ کوہسار مری؟"

"صاحب! جلوہ گری میں کوئٹہ سے کم نہیں ع

وُہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں"

"اور دِلّی؟"

"شہر بُرا نہیں۔ مگر غلط ملک میں آباد ہے۔"

"جنیوا، صحت گاہِ عالم؟"

"صاحب! مرنے کے لیے اس سے زیادہ پُر فضا مقام رُوئے زمین پر نہیں۔"

"کراچی کے متعلق کیا رائے ہے حضُور کی؟"

"بہت اچھی! اگر آپ سر کے بل کھڑے ہو کر دیکھیں تو کراچی کی ہر چیز سیدھی نظر آئے گی۔"

"یار! تُم کراچی کے ساتھ صریحًا زیادتی کرتے ہو۔"

"ہرگز نہیں! میں کراچی کے حقوق کے لیے ہمیشہ لڑتا رہُوں گا۔ اسی لیے میں اہالیانِ کراچی کے اِس مطالبے کی شد و مد سے حمایت کرتا ہُوں کہ ملیر کے پُل اور سڑک کی مرمّت ہونی چاہیے۔ ضرُور ہونی چاہیے اور جلد ہونی چاہیے تاکہ کراچی سے نکلنے میں آسانی رہے۔"

"یہی بات ہے تو تم واپس کیوں جا رہے ہو؟"

"مگر (انگشتِ شہادت اُٹھاتے ہُوئے) ایک بات ہے۔ کراچی والے آگے

ہو کر کراچی کی بُرائی کرتے ہیں، لیکن کوئی اور اُن کی ہاں میں ہاں مِلا دے تو خفا ہو جاتے ہیں۔ بس اسی ادا پہ پیار آتا ہے۔"

پھر کوئٹہ کی برتری ثابت کرتے کرتے بے دھیانی میں کہنے لگے "ہائے! یہ عظیم شہر اگر کراچی میں ہوتا تو کیا بات تھی!"

مرزا نے اتنا کہا اور دایاں ہاتھ پھیلا کر اپنا سینہ پھُلایا اور پھر اوّل الذّکر کو آخر الذّکر پر مارا۔ ایک آہِ سرد کھینچی اور خاموش ہو گئے۔

اُن کے رُخساروں پر خونِ صالح کے وہ چند قطرے چمک رہے تھے، جنھیں آتشِ روزگار نے بہت جلد خشک کر دیا۔

(اپریل سنہ ۱۹۶۳ء)

بائی فوکل کلب

چار مہینے ہونے آئے تھے۔ شہر کا کوئی لائق ڈاکٹر بچا ہو گا جس نے ہماری مالی تکالیف میں حسب لیاقت اضافہ نہ کیا ہو۔ لیکن بائیں کہنی کا درد کسی طرح کم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ علاج نے جب شدت پکڑی اور مرض نے پیچیدہ ہو کر مفلسی کی صورت اختیار کر لی تو لکھنؤ کے ایک حاذق طبیب سے رجوع کیا جو صرف مایوس اور لبِ گور مریضوں پر عملِ مسیحائی کرتے تھے۔ مریض کے جانبر ہونے کا ذرا بھی امکان نظر آتے تو بگڑ جاتے اور اسے دھتکار کر نکلوا دیتے کہ جاؤ، ابھی کچھ دن اور ڈاکٹر سے علاج کراؤ۔ اللہ نے اُن کے ہاتھ میں کچھ ایسا اعجاز دیا تھا کہ ایک دفعہ اُن سے رجوع کرنے کے بعد کوئی بیمار خواہ وہ بسترِ مرگ پر ہی کیوں نہ ہو، مرض سے نہیں مر سکتا تھا۔ دوا سے مرتا تھا۔ مرض کے جراثیم کے حق میں تو اُن کی دوا گویا آبِ حیات کا حکم رکھتی تھی۔ غریبوں کا علاج مفت کرتے، مگر رؤسا کو فیس لیے بغیر نہیں مارتے تھے۔ حکیم صاحب اُونچا سُنتے ہی نہیں، اُونچا سمجھتے بھی تھے۔ یعنی صرف مطلب کی بات۔ شاعری بھی کرتے تھے۔ ہم اس پر اعتراض کرنے والے کون؟ لیکن مصیبت یہ تھی کہ طبابت میں شاعری اور شاعری میں طبابت کے ہاتھ دکھاتے تھے۔ مطلب یہ کہ دونوں میں وزن کے پابند نہ تھے۔ حکیموں میں اپنے علاوہ، اُستاد ابراہیم ذوقؔ کے قائل تھے۔ وہ بھی نہ خُنے اس بنا پر کہ بقول آزادؔ اُستاد نے موسیقی اور نجوم سیکھنے کی سعیِ نامشکور کے بعد طب کو

چند روز کیا۔ مگر اس میں خونِ ناحق نظر آنے لگے۔ چنانچہ انہی صلاحیتوں کا رُخ اُردو شاعری کی طرف موڑ دیا۔ حکیم صاحب موصوف اپنی ذات، و بیاض پر کامل اعتماد رکھتے تھے۔ ہاں کبھی اپنی ہی ایجاد کردہ معجونِ فلک سیر کے زیرِ اثر طبیعت فراخدلی و فروتنی پر مائل ہو جاتے تو سخن فہم مریض کے سامنے یہاں تک اعتراف کر لیتے کہ ایک لحاظ سے غالب ان سے بہتر تھا۔ خط اچھے خاصے لکھ لیتا تھا۔ مگر اب وہ مکتوب الیہ کہاں جنھیں کوئی ایسے خط لکھے۔

خاندانی حکیم تھے۔ اور خاندان بھی ایسا ویسا! ان کے پردادا قصبہ سندیلہ کے جالینوس تھے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ حکیم جالینوس نابینا و کثیر الازواج نہ تھا۔ یہ تھے۔ نباضی میں چار دانگِ سندیلہ میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ راویانِ رنگیں بیاں گزارش کرتے ہیں کہ آبائی حویلی میں چار بیگمات (جن میں ہر ایک چوتھی تھی) اور درجنوں حرمیں اور لونڈیاں رُلی پھرتی تھیں۔ تہجد کے وقت حضر کرانے کی ہر ایک کی باری مقرر تھی، مگر آدھی رات گئے آواز دے کر سب کی نیند خراب نہیں کرتے تھے۔ ہولے سے نبض چھو کر باری والی کو جگا دیتے تھے۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ غلط نبض پر ہاتھ ڈالا ہو۔

نبیرۂ جالینوس نے ہماری نبض، زبان، جگر، پیٹ، ناخن، قارورہ، پپوٹے ۔۔۔ مختصر یہ کہ سوائے کہنی کے ہر چیز کا معائنہ فرمایا۔ فیس کا تعین کرنے سے پہلے ہماری کار کا انجن بھی اسٹارٹ کروا کے بچشمِ خود ملاحظہ فرمایا اور فیس معاف کر دی۔ پھر بھی احتیاطاً پوچھ لیا کہ مہینے کی آخری تاریخوں میں آنکھوں کے سامنے ترمرے ناچتے ہیں؟ ہم نے سر ہلا کر اقرار کیا تو مرض اور اردو زبان کے مزے لوٹتے ہوئے فرمایا کہ دست بخیر! مقامِ ماؤف پہ جو درد ہے، درد میں جو چپک ہے، چپک میں جو ٹیس ہے، اور ٹیس میں جو کسک رہ رہ کر محسوس ہوتی ہے، وہ ریاحی ہے! بقولِ مرزا 'یہ تشخیص نہ تھی، ہمارے مرض کی توہین تھی۔ ہمارے

اپنے جراثیم کے منہ پر ملا تھا۔ چنانچہ یونانی طب سے ہمارا اعتقاد چوبیس گھنٹوں کے لیے بالکل اٹھ گیا۔ ان چوبیس گھنٹوں میں ہم نے کہنی کا ہر زاویے سے ایکس رے کرایا لیکن اس سے مایوسی اور بڑھی۔ اس لیے کہ کہنی میں کوئی خرابی نہیں نکلی!

پورے دو مہینے مرض میں ہندو یوگ آسن اور میتھی کے ساگ کا اضافہ کرنے کے بعد ہم نے مرزا سے ساری کیفیت بیان کی۔ استماعِ حال کے بعد ہماری دائیں کہنی پر دو انگلیاں رکھ کر آنکھوں سے نبض دیکھی۔ ہم نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا تو بولے، "چالیس سال بعد مرد کا دل نیچے اُتر آتا ہے! پھر فرمایا، "تمہارا علاج یہ ہے کہ فوراً بائی فوکل★ بنوالو۔ ہم نے کہا مرزا! ہم تو شراب بھی نہیں پیتے۔ کہنی کا آنکھ سے کیا تعلق؟ بولے، چار پانچ مہینے سے دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری پاس کی نظر بھی خراب ہو گئی ہے۔ کتاب نزدیک ہو تو تم پڑھ نہیں سکتے۔ تقاضائے سِن یہی کہنا چاہیے۔ تم اخبار اور کتاب کو آنکھ سے تین فٹ دُور بائیں ہاتھ میں پکڑ کے پڑھتے ہو۔ اسی لیے ہاتھ کے پٹھے اکڑ گئے ہیں۔ چنانچہ کہنی میں جو درد ہے، درد میں جو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ۔

مانا کہ مرزا ہمارے مونس و غم خوار ہیں، لیکن اُن کے سامنے افشائے مرض کرتے ہوئے ہمیں ہول آتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے فقیری چٹکلوں سے اصل مرض کو تو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دیتے ہیں، لیکن تین چار نئے مرض گلے پڑ جاتے ہیں، جن کے لیے پھر انہی سے

★ بائی فوکل: اُس عینک کو کہتے ہیں، جس میں دو شیشے اُوپر نیچے جڑے ہوں۔ اُوپر والا شیشہ دُور کی چیزیں دیکھنے کے لیے اور نچلا صرف پڑھنے کے لیے۔ ایسی عینک کی ضرورت عام طور پر آدھی عمر اِدھر، آدھی عمر اُدھر، یعنی چالیس برس کے بعد پڑتی ہے۔ اللہ کے خاص بندوں پر البتہ یہ عجب وقت پہلے بھی آن پڑتا ہے۔

رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ ہر دفعہ اپنے علاج سے ہر مرض کو چار سے ضرب دیتے چلے جاتے ہیں۔ فائدہ اس طریقِ علاج کا یہ ہے کہ شفائے جزوی کے بعد جی پھر علالتِ اصلی کے رات دن ڈھونڈتا ہے۔ اور مریض کو اپنے مُفرد مرض کے مرحوم جراثیم بے طرح یاد آتے ہیں اور وہ اُن کی شفقتوں کو یاد کر کر کے روتا ہے۔ کچھ دنوں کی بات ہے۔ ہم نے کہا، مرزا! تین چار مہینے سے ہمیں تکیے پر صبح درجنوں سفید بال پڑے ملتے ہیں۔ فرمایا، اپنے تکیے پر؟ عرض کیا ہاں! شرلک ہومز کے مخصوص جاسوسی انداز میں چند منٹ گہرے غور و خوض کے بعد فرمایا، غالباً تمھارے ہوں گے۔ ہم نے کہا، ہمیں بھی یہی شبہ ہوا تھا۔ بولے، بھائی میرے! تم نے تمام عمر ضبط و احتیاط سے کام لیا ہے۔ اپنے نجی جذبات کو ہمیشہ شرعی حدود میں رکھا ہے۔ اسی لیے تم ۴۸ سال کی عمر میں گنجے ہو گئے ہو! اس تشخیص کے بعد انھوں نے ایک روغنی خضاب کا نام بتایا، جس سے بال کالے اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چلتے وقت انھوں نے ہمیں سختی سے خبردار کیا کہ تیل برش سے لگایا جائے ورنہ ہتھیلی پر بھی بال نکل آئیں گے، جس کے وہ اور دوا ساز کمپنی ہرگز ہرگز ذمہ دار نہ ہوں گے۔ واپسی میں ہم نے انتہائی بے صبری کے عالم میں سب سے بڑے سائز کی شیشی خریدی اور دُکاندار سے ریزگاری بھی واپس نہ لی کہ اس میں سراسر وقت کا زیاں تھا۔ چالیس دن کے مسلسل استعمال سے یہ اثر ہوا کہ سر پر جتنے بھی کالے بال تھے، وہ تو ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔ البتہ جتنے سفید بال تھے، وہ بالکل مضبوط ہو گئے۔ چنانچہ آج تک ایک سفید بال نہیں گرا، بلکہ جہاں پہلے ایک سفید بال تھا، وہاں اب تین نکل آئے ہیں۔

بائی فوکل کا نام آتے ہی ہم سنبھل کے بیٹھ گئے۔ ہم نے کہا، مرزا! مگر ہم تو ابھی چالیس سال کے نہیں ہوتے۔ بولے، مرض کے جراثیم پڑھے لکھے نہیں ہوتے کہ کیلنڈر دیکھ کر حملہ کریں۔ ذرا حال تو دیکھو اپنا۔ صحت ایسی کہ بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ نام سے بھاگتے ہیں۔ صورت ایسی

جیسے معاف کرنا، ریڈیو فوٹو۔ اور رنگ بھی اب گندمی نہیں رہا۔ خوفِ الٰہی و اہلیہ سے زرد ہو گیا ہے۔ اگر کبھی یاروں کی بات مان لیتے تو زندگی سنور جاتی۔ ہم نے کہا، ہمارا جو حال ہے وہ تنہا ایک آدمی کے غلط فیصلوں سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہمیں تو اس میں پوری قوم کا ہاتھ نظر آتا ہے! فرمایا، جاپان میں فنِ باغبانی کے ایک مخصوص شعبے بونسائی کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے ماہر پُشت در پُشت درختوں کو اس چاؤ چونچلے سے اگاتے اور سینچتے ہیں اور ان کی اٹھان کو اس طرح قابو میں رکھتے ہیں کہ تین تین سو سال پرانے درخت میں پھل پھول بھی آتے ہیں، پت جھڑ بھی ہوتا ہے، مگر ایک بالشت سے اونچا نہیں ہونے پاتا۔ تم نے اپنی شخصیت کو اسی طرح پالا پوسا ہے۔

ہم نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا، مرزا! ہم ایسے نہ ہوتے تو تم کسے نصیحت کرتے؟ کچھ نرم پڑے۔ فرمایا، نصیحت سے غرض اصلاح کس مسخرے کو ہے۔ مگر تم نے دماغ سے کبھی کام نہیں لیا۔ خالی چال چلن کے برتے پر ساری زندگی گزار دی۔ ہم نے کہا، مرزا! تم تو یہ نہ کہو۔ ہم تمام عمر اپنی خواہشات سے گوریلا جنگ کرتے رہے ہیں۔ تم ہمارے دل کے کھوٹ سے واقف ہو۔ یہ آتشِ شوق

پوری بجھی نہیں، یہ بجھائی ہوئی سی ہے

جہاں تک اعمال کا تعلق ہے، خدا شاہد ہے کہ ہمارا کوئی کام، کوئی عمل خلافِ شرع نہیں۔ لیکن اگر جنّت و دوزخ کا فیصلہ فقط نیت کی بناء پر ہوا تو ہمارے دوزخ میں جانے میں خود ہمیں کوئی شبہ نظر نہیں آتا۔ مسکرا دیے۔ فرمایا، جن خواتین نے اپنی خوبصورتی سے تمہارے دھیان گیان میں خلل ڈالا، ان کی تعداد کچھ نہیں تو، کراچی کی نصف آبادی کے برابر تو ہوگی؟

ہم نے مرزا کو یاد دلایا کہ لڑکپن ہی سے ہم پُرامن زندگی بسر کرنے کے سخت خلاف

لیتے ہیں۔ مار دھاڑ سے بھرپور جمیس بانڈ جیسی زندگی گزارنے کی خاطر کیسے کیسے جتن کیے۔ انہیں تو کیا یاد ہوگا، قاضی عبدالقدوس ان دنوں ہمیں BULL FIGHTING کی ٹریننگ دیا کرتے تھے۔ اور ایک داڑھی دار بوک بکرے کو سرخ ترکی ٹوپی پہنا کر، ہمیں اس کے خلاف اشتعال دلایا کرتے تھے۔ مڈل میں ۳۳ نمبر سے حساب میں فیل ہونے کے بعد ہم نے ذریعۂ معاش کے بارے میں یہ فیصلہ کیا کہ والدہ اجازت دے دیں تو PIRATE (بحری قزاق) بن جائیں۔ لیکن جب سن شعور کو پہنچے اور انگریز حکمرانوں سے نفرت کے ساتھ ساتھ نیک و بد کی تمیز بھی پیدا ہوئی تو زندگی کے نصب العین میں، مرزا ہی کے مشورے سے، اتنی اصلاح کرنی پڑی کہ صرف انگریزوں کے جہازوں کو لوٹیں گے۔ مگر اُن کی میموں کے ساتھ بدسلوکی نہیں کریں گے۔ نکاح کریں گے۔

فرمایا "یہ سب علامتیں "مڈل ایج" کی ہیں، جو تمہارے کیس میں ذرا سویرے ہی آ گئی ہے۔ ایک روسی انارکسٹ نے ایک دفعہ کیا اچھی تجویز پیش کی تھی کہ ۲۵ سال سے زائد عمر والوں کو پھانسی دے دی جائے۔ لیکن پھانسی سے زیادہ عبرت ناک سزا تم جیسوں کے لیے یہ ہوگی کہ انہیں زندہ رہنے دیا جائے۔ "مڈل ایج" کا بجز پیری کوئی علاج نہیں۔ ہاں تنگ دستی اور تصوف سے تھوڑا بہت آرام آجاتا ہے۔ ہمارے یہاں سن یاس کے لے دے کے، دو ہی مشغلے ہیں۔ عیاشی ـــــ اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو ـــــ تصوف! اور قوالی ان دونوں کا عطر فتنہ ہے!

"اور تمہارا علاج ہے، ایک عدد باقی فوکل اور جمعرات کی جمعرات قوالی! دو دن سے سائیں گلمبر شاہ کا عرس ہو رہا ہے۔ آج رات بھی ہمارے پیر صاحب قبلہ نے محفل سماع کا اہتمام فرمایا ہے۔ مٹکے والے قوالوں کی چوکی کے علاوہ حیدرآباد کی ایک طوائف بھی ہدیۂ نیاز پیش کرے گی۔"

ہم نے پوچھا "زندہ طوائف؟" بولے "ہاں! سچ مچ کی! مرے کیوں جا رہے ہو؟ شین قاف کے

علاوہ نک سِک سے بھی دُرست۔ حضرت سے بیعت ہونے کے بعد اُس نے شادی بیاہ کے مجروں سے توبہ کر لی ہے۔ اب صِرف مزاروں پر گاتی ہے یا ریڈیو پاکستان سے! اور صاحب! ایسا گاتی ہے، ایسا گاتی ہے کہ گھنٹوں دیکھتے رہو! ہنستے کیا ہو۔ ایک نکتہ آج بتائے دیتے ہیں

—— گانے والی کی صُورت اچھّی ہو، تو مُہمل شعر کا مطلب بھی سمجھ میں آجاتا ہے"۔

عِشاء کے بعد ہم نے قوّالی کی تیاریاں شرُوع کیں۔ عید کا کڑھا ہُوا کرتا پہنا۔ جُمعہ کی نماز والے خاص جُوتے نکالے۔ (مسجد میں ہم کبھی عام جُوتے پہن کر نہیں جاتے۔ اس لیے کہ جُوتے اگر ثابت ہوں تو سجدے میں بھی دل اُنھیں میں پڑا رہتا ہے) مرزا ہمیں لینے آئے تو نتھنے پھڑکاتے ہوئے دریافت کیا کہ آج تُم میں سے جنازے کی سی بُو کیوں آرہی ہے؟ ہم نے گھبرا کر اپنی نبض دیکھی۔ دل تو ابھی دھڑک رہا تھا۔ کُچھ دیر بعد بات سمجھ میں آئی تو ہم نے اقرار کیا کہ گرم شیروانی دو سال بعد نکالی ہے۔ کافوری گولیوں کی بُو بُری طرح بس گئی تھی۔ اسے دبانے کے لیے تھوڑا سا حِنا کا عِطر لگا لیا ہے۔ کہنے لگے، جہاں آدابِ محفل کا اِتنا لحاظ رکھا ہے وہاں اِتنا اور کرو کہ ایک ایک رُوپے کے نوٹ اندر کی جیب میں ڈال لو۔ ہم نے پُوچھا کیوں؟ فرمایا، جو شعر تُمھاری یا میری سمجھ میں آجائے، اُس پر ایک نوٹ ادب کے ساتھ نذر کرنا پہنچا۔

تمام رات ہماری یہ دُہری ڈیوٹی رہی کہ دامِ شُنیدن بچھائے بیٹھے رہیں اور اس شغلِ شبینہ کے دَوران مرزا کے چہرے پر بھی مُستقل نظر جمائے رہیں کہ جُوں ہی اُن کے نتھنوں سے ہویدا ہو کہ شعر سمجھ میں آگیا ہے، اپنی ہتھیلی پہ نوٹ رکھ کر پیر و مُرشد کو نذر گزرانیں اور وہ اُسے چھُو کر قوّالوں کو بخش دیں۔ ★

★ مزاج داں جانتے ہیں کہ مُہمل شعر سمجھ میں آجائے تو مرزا کے نتھنے خرگوش کی طرح پھڑکنے لگتے ہیں۔

اپنی ذات سے مانوس لوگوں کا اس سے زیادہ نمائندہ اجتماع ہم نے اپنے چالیس سالہ تجربے میں نہیں دیکھا۔ شہر کے چوٹی کے ادھیڑ یہاں موجود تھے۔ ذرا دیر بعد پیر صاحب تشریف لائے۔ بھاری بدن۔ نیند میں بھری ہوئی آنکھیں۔ چھاج سی داڑھی۔ کترواں لبیں۔ ٹخنوں تک گیروا کرتا۔ سر پر سیاہ مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی جس کے نیچے روپہلی بالوں کی گنگا۔ ہاتھ میں سبز جریب۔ ساز ملائے گئے یعنی ہارمونیم کو تالیوں سے اور تالیوں کو ٹھیکے سے ملایا گیا۔ اور جب کلامِ شاعر کو ان تینوں کے تابع کر لیا گیا تو قوالی کا رنگ جما۔ ہمارا خیال ہے کہ اس پائے کے مُغنّیوں کو تو مغلوں کے زمانے میں پیدا ہونا چاہیے تھا، تاکہ کوئی بادشاہ انھیں ہاتھی کے پاؤں تلے رُندوا ڈالتا۔ اُنھوں نے مولانا جامیؔ کے کلام میں میرا بائی کے دوہوں کو اس طرح شیر و شکر کیا کہ فارسی زبان سر تا سر ماڑواڑی بولی ہی کی بگڑی ہوئی شکل معلوم ہونے لگی اور ہم جیسے بے علموں کو تو اصل پر نقل کا دھوکا ہونے لگا۔

قوّالی شروع ہوئی ہے تو ہم پانچویں صف میں دو زانو بیٹھے تھے۔ نہیں، محض دو زانو نہیں، اس طرح بیٹھے تھے جیسے التحیّات پڑھتے وقت بیٹھتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی محفل رنگ پر آئی، ہم حال کھیلنے والوں کے دھکّے کھاتے کھاتے اتنے آگے نکل گئے کہ رات بھر ٹانگیں غلیل کی طرح پھیلائے ایک ہارمونیم کو گود میں لیے بیٹھے رہے۔ ایک نَو وارد نے ہمیں ایک رُوپیہ بھی دیا۔ ہمارا حشر یعنی چلتے پانی بھی قوّالوں کے ساتھ ہوا۔ دھکّوں کے ریلے میں ہم قوّالوں کی ٹولی کو چیرتے ہوئے دُوسرے دروازے سے کبھی کے باہر نکل پڑے ہوتے، مگر بڑی خیریت گزری کہ ایک کلارنیٹ نے ہمیں بڑی مضبوطی سے روکے رکھا۔ یہ کلارنیٹ کوئی سوا گز لمبا ہوگا۔ اس کا بے ضرر سِرا تو سازندے کے مُنہ میں تھا، لیکن پھَن ہمارے کان میں ایسا فِٹ ہو گیا تھا کہ زور کے دھکّوں کے باوجود ہم ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔

آخرِ شب حضرت نے بطورِ خاص فرمائش کر کے طوائف سے اپنی ایک بحر سے خارج غزل گوائی جسے اس غیرتِ ناہید نے سُر تال سے بھی خارج کر کے سہ آتشہ کر دیا۔ حضرت اپنا کلام سُن کر اس قدر آبدیدہ ہوئے کہ چھپا ہُوا رُومال (جس کے حاشیے پر چند اشعار کھانے کی فضیلت میں رقم تھے) تر ہو گیا۔ مقطع جی توڑ کر گایا اور زبان پہ بارِ خدایا شاعر کا نام آیا تو ناچتے ہُوئے جا کر سر سامنے کر دیا۔ حضرت نے ازراہِ پرورش اصلی چھوہارے کی گُٹھلیوں کی ہزار دانہ تسبیح اپنے دستِ غنا آلود سے اُس کے گلے میں ڈال دی۔ اور اپنی خاکِ پا اور حُجرۂ خاص کی جارُوب بھی مرحمت فرمائی۔ چار بجے جب سب کی جیبیں خالی ہو گئیں تو بیشتر کو حال آ گیا۔ اور ایسی دھمال مچی کہ تکیہ کے گنبد کی ساری چمگادڑیں اُڑ گئیں۔ کسی کے پاؤں کی ضربِ مستانہ سے حضرت کے خلیفہ کی گھڑی کا شیشہ چُور چُور ہو گیا اور اب وُہ بھی اپنی دستارِ خلافت، جُبّہ، بائی فوکل اور چاندی کے بٹن اُتار کر میدان میں کُود پڑے صرف انگوٹھی اور موزے نہیں اُتارے۔ سو وُہ بھی بحالتِ مستی کسی نے اُتار لیے۔ نوٹوں کی بوچھاڑ بند ہوئی اور اب ہر بیت پر جزاک اللہ، جزاک اللہ کا غلغلہ بلند ہونے لگا۔ اس بھاگ بھری نے جو دیکھا کہ بندوں نے اپنا ہاتھ کھینچ کر اب مُعاملہ اللہ کے سپُرد کر دیا ہے تو جھٹ آخری گلوری گلے میں دبا کے کھرے دے پر محفل ختم کر دی۔

پانچ بجے صُبح ہم کان سہلاتے محفلِ سمع خراشی سے لَوٹے۔ کُچھ مہمل کلام کا، کُچھ خُود رفتگیِ شب کا خمار، ہم ایسے غافل سوئے کہ صُبح دس بجے تک سناتے رہے۔ اور بیگم ہمارے پلنگ کے گرد منڈلاتے ہوئے بچّوں کو سمجھاتی رہیں "کمبختو! آہستہ آہستہ شور مچاؤ۔ ابّا سو رہے ہیں۔ رات بھر اس منحُوس مرزا کی مصاحبی کی ہے۔ آج دفتر نہیں جائیں گے۔ ارے او بلیہ کی بچّی! گھڑی گھڑی دروازہ مت کھول۔ مکھیوں کے ساتھ اِن کے مُلاقاتی بھی گھُس آئیں گے۔" شام کو مِرزا چلتے پھرتے اِدھر آ نکلے اور (وُہ رُوحانی طمانیت اور رونق دیکھ کر

جو ہمارے مُنہ پر دفتری فرائض ادا نہ کرنے سے آجاتی ہیں) کہنے لگے "دیکھا! ہم کہتے تھے ایک ہی صحبت میں رنگ نکھر آیا۔ رات حضرت نے توجّہ فرمائی۔ قلب پر کوئی اثر مرتّب ہوا؟ رڈِ عمل ہوا؟" ہم نے کہا "ردّیا دڈیا تو ہم جانتے نہیں۔ البتّہ صبح ایک عجیب و غریب خواب دیکھا کہ بغداد میں سنگِ مرمر کی ایک عالیشان محل سرا ہے جس کے صدر دروازے پر قومی پرچم کی جگہ ایک "بکینی" لہرا رہی ہے۔ چھت وینس ڈی ملو کے مجسّموں پر ٹھیری ہوئی ہے۔ حمام کی دیواریں شفّاف بلّور کی ہیں۔ مرکزی قالین کے گرداگرد غیر محفوظ فصل سے مخملی گاؤ تکیوں کی جگہ تنک لباس کنیزیں آڑی لیٹی ہیں اور شیوخ ان کی گداز ٹیک لگائے ایک دوسرے کے گاؤ تکیے کو آنکھ مار رہے ہیں۔ سامنے ایک زنِ پُرفن نقّاروں پر اپنی آنکھیں انجیر کے پتّے سے ڈھانپے برہنہ رقص کر رہی ہے اور پاؤں سے انہی نقّاروں پر تال دیتی جاتی ہے دل بھی اسی تال کے مطابق دھڑک رہے ہیں۔ غرض کہ ایک عالم ہے۔ اُمراء کے آنڈو بازو کنیزوں اور پیش خدمتوں کے پَرے کے پَرے منتظر ہیں کہ ابروئے طلب کی جنبشِ نیم شبی پر اپنی لذّتیں اس پر تمام کر دیں۔ یہ وقفہ وقفہ سے شراب، کباب اور اپنے آپ کو پیش کرتی ہیں۔ اسی قالین کے سیاہ حاشیے پر چالیس غلام ہاتھ باندھے نظریں جھکائے کھڑے ہیں۔ اور میں ان میں سے ایک ہوں!

"اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ، بھاری بدن، نیند میں بھری ہوئی آنکھیں داڑھی اتنی لمبی کہ ٹائی لگائیں تو نظر نہ آئے۔ سبز جریب ٹیکتے آرہے ہیں۔ ہم نے اپنی ہتھیلی پر سو روپے کا نوٹ رکھ کر پیش کیا۔ حضرت نے نوٹ اٹھا کر وہ جگہ چومی جہاں نوٹ رکھا تھا اور بشارت دی کہ بارہ برس بعد تیرے بھی دن پھر جائیں گے۔ تو باون سال کی عمر میں ایک بھرے پُرے حرم کا مالک ......"

مرزا کا چہرہ لال انگارہ ہو گیا۔ قطع کلام کرتے ہوئے فرمایا

"تم جسم شاعر کا، مگر جذبات گھوڑے کے رکھتے ہو!"

پھر انھوں نے لعن طعن کے وہ دفتر کھولے کہ عاجز نے کھڑے کھڑے تمام میکنوں کو مع لباسِ مختصر، حرم سے نکال باہر کیا۔

تین نو وارد گیشائیں تھیں کہ جن کے ویزا کی ابھی آدھی مدت بھی ختم نہیں ہوئی تھی کیسے کہوں کہ انھیں بھی اس ہڑبونگ میں زادِ راہ دیے بغیر نکال دیا!

اور ان کے ساتھ ساتھ تصوّف کا خیال بھی ہمیشہ ہمیش کے لیے دل سے نکال دیا۔

قلبِ سیاہ پر قوالوں کے تصرّفاتِ باطنی آپ ملاحظہ فرما چکے۔ اب بائی فوکل کا حال سنیے۔ عینک ہمارے لیے نئی چیز نہیں۔ اس لیے کہ پانچویں جماعت میں قدم رکھنے سے پہلے ہماری عینک کا نمبر ۷ ہو گیا تھا۔ جو قارئین ننگی آنکھ (انگریزی ترکیب ہے، مگر خوب ہے) سے دیکھنے کے عادی ہیں انھیں شاید اندازہ نہ ہو کہ ۷ نمبر عینک کیا معنی رکھتی ہے۔ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ اندھا بھینسا کھیلتے وقت بچے ہماری آنکھوں پر پٹی نہیں باندھتے تھے۔ ہمارا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ناک صرف اس لیے بنائی ہے کہ عینک ٹِک سکے۔ اور جو بچارے عینک سے محروم ہیں، ان کی ناک محض زکام کے لیے ہے..... دادا جان قبلہ کا عقیدہ تھا کہ عربی نہ پڑھنے کے سبب سے ہم نصف نابینا ہو گئے ہیں۔ ورنہ اس معزز خاندان* کی تاریخ میں ڈیڑھ سو سال سے کسی بزرگ نے عینک نہیں لگائی۔ اللہ اللہ! کیسا سستا سماں اور کیسے سادہ دل بزرگ تھے کہ گرلز پرائمری اسکول کی بس کا راستہ کاٹنے کو تماش بینی گردانتے تھے! آج

* معزز خاندان: جس کا سلسلہ نسب ڈیڑھ دو لاکھ واسطوں سے حضرت آدم علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔

ہمیں اس کا ملال نہیں کہ وہ ایسا کیوں سمجھتے تھے، بلکہ اس کا ہے کہ ہم خود یہی کچھ سمجھ کر جایا کرتے تھے! اور جب ہم چوری کی چونّی سے بائیسکوپ دیکھ کر رات کے دس بجے پنجوں کے بل گھر میں داخل ہوتے تو ڈیوڑھی میں ہمیں خاندان کے تمام بزرگ نہ صرف خود گارڈ آف آنر دیتے، بلکہ اپنی کمک پر بیرونی بوڑھوں کو بھی بلا لیتے تھے کہ مقابلہ ہمارے فسق و فجور سے تھا۔

عینک پر پھبتیاں سنتے سنتے ہمارا کمسن کلیجہ چھلنی ہو گیا تھا۔ لہٰذا دو سال بعد جب دادا جان کا موتیا بند کا آپریشن ہوا تو ہم نے اس خوشی میں بچّوں کو لیمن ڈراپ تقسیم کیں۔ دراصل ہم سب بچّے انھیں "پرابلم" بزرگ سمجھا کرتے تھے۔ وہم کے مریض تھے۔ آپریشن سے پہلے مصنوعی بتّیسی کے ایک اگلے دانت میں درد محسوس کر رہے تھے، جس کا علاج ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے کرانے کے بعد انھوں نے وہ دانت ہی اکھڑوا دیا تھا اور اب اس کی کھڈّی میں حقّے کی نقرئی مہنال فٹ کر کے گھنٹوں ہمارے تاریک مستقبل کے بارے میں سوچا کرتے تھے۔ ہاں تو ہم کہہ یہ رہے تھے کہ آپریشن کے بعد وہ آدھ انچ موٹے شیشے کی عینک لگانے لگے تھے، جس سے اُن کی غصیلی آنکھیں ہم بچّوں کو تگنی بڑی دکھائی دیتی تھیں۔ اللہ جانے خود انھیں بھی اس سے کچھ دکھائی دیتا تھا یا نہیں۔ اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوتا تھا کہ اسی زمانے میں ابّا جان چوکیداری کے لیے ایک سنہری رنگ کا بوڑھا کتّا لے آئے تھے، جسے کم نظر آتا تھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دادا جان کو کتّا اور کتّے کو وہ نظر نہیں آتے تھے۔ ہماری یہ ڈیوٹی لگی ہوئی تھی کہ ہر دو فریقین کو ایک دوسرے کے حلقۂ گزند سے دور رکھیں۔ بالخصوص مغرب کے وقت۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ ہماری غفلت سے وہ وضو کر کے ہرن کی کھال کے بجائے کتّے پر بیٹھ جاتے اور مؤخر الذکر، اوّل الذکر پر

بھونکنے لگتا تو وہ راقم الحروف پر چیختے کہ اندھا ہو گیا ہے کیا؟ عینک لگا کے بھی اتنا بڑا کُتا نظر نہیں آتا!

دعویٰ تو مرزا اور عینک ساز دونوں نے یہی کیا تھا کہ بالائی غُرفے سے دُور کی اور زیریں غُرفے سے پاس کی چیزیں صاف نظر آئیں گی۔ پروفیسر قاضی عبدالقدّوس نے تو یہاں تک اُمید بندھائی تھی کہ دُور کے شیشے سے اپنی بیوی اور پاس کے شیشے سے دُوسرے کی بیوی کا چہرہ نہایت بھلا معلوم ہو گا۔

غافل نے اِدھر دیکھا، عاقل نے اُدھر دیکھا

لیکن قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کے بعد کُھلا کہ بائی فوکل سے نہ دُور کا جلوہ نظر آتا ہے نہ پاس کا۔ البتہ صبر آ جاتا ہے۔ یہاں تک تو بسا غنیمت ہے کہ ہم بندوق کی لبلبی نچلے شیشے اور مکھی اُوپر والے شیشے سے ملاحظہ فرمائیں۔ اور اگر تیتر بندوق کی نال میں چونچ ڈالے کارتوس کا معائنہ کر رہا ہے تو پھر بچ کے نہیں جا سکتا۔ خیر، شکار کو جانے دیجیے کہ یُوں بھی ہم جیو ہتیا کے خلاف ہو گئے ہیں۔ (زین بدھ ازم اور اہنسا کی تعلیمات سے قلب ایسا رقیق ہوا ہے کہ اب دلی خواہش یہی ہے کہ خوبصورت پرند کو جان سے مارے بغیر اس کا گوشت کھا سکیں)

لیکن زینہ سے اُترتے وقت

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے

اور جہاں پاؤں پڑتا ہے، وہاں سیڑھی نہیں ہوتی۔ مرزا سے اِس صُورتِ خاص کا ذکر کیا تو کہنے لگے کہ عینک ہر وقت لگائے رکھو۔ لیکن جہاں نظر کا کام ہو، وہاں ایک خوبصورت سی چھڑی ہاتھ میں رکھا کرو۔ لاہور میں عام ملتی ہیں۔ ہم نے کہا، لاہور میں جو خوبصورت چھڑیاں عام ملتی ہیں، وہ ہمارے شانے تک آتی ہیں۔ ہم انھیں ہاتھ میں نہیں رکھ سکتے۔

بغل میں بیساکھی کی طرح دبائے پھر سکتے ہیں۔ مگر لالہ رُخسارانِ لاہور اپنے دل میں کیا کہیں گے؟ بولے، تو پھر ایک کُتا ساتھ رکھا کرو۔ تمھاری طرح وفادار نہ ہو تو مضائقہ نہیں، لیکن نابینا نہ ہو۔

ہم تو اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شاہانِ سلف، بالخصوص بعض مُغل فرمانروا، اپنے سرکش صُوبیداروں، شورہ پُشت شہزادوں اور تخت و تاج کے دعویدار بھائیوں کی جلّاد سے آنکھیں نکلوا کر خود کو تاریخِ ہند مؤلفہ ایشوری پرشاد میں خواہ مخواہ رُسوا کر گئے۔ اِن سب کو (بشمُول ایشوری پرشاد) بائی فوکل لگوا دیتے تو اوروں کو کان ہو جاتے اور یہ دُکھیارے بھیک مانگنے کے لائق بھی نہ رہتے۔ ہمارا خیال ہے کہ نہ دیکھنے کا اِس سے زیادہ سائنٹیفک آلہ آج تک ایجاد نہیں ہوا۔ ذرا کھُل کر بات کرنے کی اِجازت ہو تو ہم یہاں تک کہہ گزریں گے کہ بائی فوکل عِفّتِ نگاہ کا ضامن ہے۔ مثلاً عینک کے بالائی حصّے سے مقابل بیٹھے ہُوئے بُتِ سیم تن کے سرتاج کی جبر جنگ مونچھ کا ایک ایک بال گِنا جا سکتا ہے، لیکن جب ریشمیں ساری ہمارے ہی رُخ سرک کر پنڈلی سے اُوپر یوں چڑھ جائے کہ

نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے، کبھی تو دیکھے گا

تو صاحب! اِس بے حیائی کا مُطالعہ یکسُوئی سے نہ اُوپر کے شیشے سے کیا جا سکتا ہے، نہ نیچے کے شیشے سے۔ اور یُوں گرہستی آدمی ایک گناہ سے بچ جاتا ہے

وُہ اِک گُنہ جو بظاہر گُناہ سے کم ہے

اِتنا ضرُور ہے کہ اسے لگانے کے بعد مزید تین عینکوں کا اِہتمام لازم آتا ہے ایک دُور کی۔ دُوسری پاس کی اور تیسری بغیر شیشوں والی —— دیکھنے کے لیے۔ یہ

آلاتِ تعیش اِس لیے بھی ضروری ہیں کہ یُوں دِکھانے کو اَدھیڑ آدمی کے مُنہ پر آنکھ، آنکھ میں پُتلی، پُتلی میں تِل اور تِل میں غالباً بینائی بھی ہوتی ہے، لیکن تین سے پانچ فٹ دُور کی چیز کِسی طور بائی فوکل کے فوکس میں نہیں آتی۔ ایک سانحہ ہو تو بیان کریں۔ پرسوں رات دعوتِ ولیمہ میں جس چیز کو ڈونگا سمجھ کر ہم نے جھپاجھپ اِس میں سے پُلاؤ کی ساری بوٹیاں گرالیں، وُہ ایک مولوی صاحب کی پلیٹ نکلی جو خُود اُس وقت زردے کی کشتی پر بُری نظر ڈال رہے تھے۔ یا کل رات گھُپ اندھیرے سینما ہال میں انٹرول (جسے مرزا وقفۂ تاک جھانک کہتے ہیں) کے بعد شانے پر ہاتھ رکھتے، جس سیٹ تک پہنچنے کی کوشش کی وُہ سیٹ ہماری نہیں نکلی۔ اور نہ وُہ شانہ ہماری اہلیہ کا!

اِنسان کی کوئی محرُومی خالی از حکمت نہیں۔ جیسے جیسے کچھ درد بقدر ہماری تاب و تحمّل کے ہمیں عطا ہوتا ہے، قلب بصیرتوں سے گداز ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اِنسان جب چشم و گوش کا مُحتاج نہ رہے اور اسے اٹکل سے زندگی گزارنے کا ہُنر آجائے تو صحیح معنوں میں نظم و ضبط کا آغاز ہوتا ہے۔ مرزا کے علاوہ بھلا یہ اور کِس کا قول ہو سکتا ہے کہ کایا کا سُکھ چاہو تو جوانی میں بہرے بن جاؤ اور بُڑھاپے میں اندھے۔ ہوس سیر و تماشا تو خیر بُرانی بات ہوئی، ہم تو اب بینائی کا بھی ہَوکا نہیں کرتے۔ ہو ہو، نہ ہو نہ ہو۔ اب تو ہر چیز کو اپنی جگہ رکھنے کی عادت پڑگئی ہے۔ الماری میں دائیں طرف پتلون، بائیں طرف پُرانی قمیضیں جنھیں اب ہم صرف بند گلے کے سوئٹر کے نیچے پہن سکتے ہیں۔ دُوسرے خانے میں سلیقے سے تہ کیا ہُوا بند گلے کا سوئٹر جو اب صرف بند گلے کے کوٹ کے نیچے پہنا جا سکتا ہے۔ آنکھ بند کر کے جو چاہو نکال لو۔ غرض کہ ہر چیز کا اپنا مقام بن جاتا ہے۔ جانماز کی جگہ جانماز۔ رِقّت انگیز ناول کی جگہ آنسوؤں سے بھیگی ہُوئی پیپر بک۔ محبُوبہ

کی جگہ منکوحہ ۔۔۔۔ تکیہ کی جگہ گاؤ تکیہ!

ذرا ترتیب بگڑی اور آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی۔ لیکن جس گھر میں بفضلِ تعالیٰ بچے ہوں، وہاں یہ رکھ رکھاؤ ممکن نہیں۔ اور رکھ رکھاؤ تو ہم نے تکلّفاً کہہ دیا ورنہ سچ پوچھیے تو کچھ بھی ممکن نہیں۔

دل صاحبِ اولاد سے انصاف طلب ہے

ایک دن ہم نے جھنجلا کر بیگم سے کہا، یہ کیا اندھیر ہے۔ تمھارے لاڈلے ہر چیز جگہ سے بے جگہ کر دیتے ہیں۔ کل سے چاقو غائب تھا۔ ابھی عقدہ کھلا کہ اس سے گڑیا کا اپنڈکس نکالا گیا تھا! تنک کر بولیں، اور کیا کلھاڑی سے گڑیا کا پیٹ چیرا جاتا؟ ہم نے جھٹ اُن کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا، ہاں! یہ کیسے ممکن ہے۔ اس لیے کہ کلھاڑی کے ڈنڈے سے تو اس گھر میں کپڑے دھوئے جاتے ہیں! تم ہی بتاؤ، صبح تازہ مضمون کی ناؤ بلکہ پورا بیڑا ٹب میں صفحہ وار نہیں چل رہا تھا؟ تمھارے گھر میں ہر چیز کا ایک نیا طریقۂ استعمال، ایک نیا فائدہ دریافت ہوتا ہے ۔۔۔۔ سوائے میرے! تمھارے سامنے کی بات ہے۔ کہہ دو، یہ بھی جھوٹ ہے۔ پرسوں دوپہر اخبار پڑھتے پڑھتے ذرا دیر کو آنکھ لگ گئی۔ کھلی تو عینک غائب۔ تم سے پوچھا تو اُلٹی ڈانٹ پڑی "ابھی سے کاہے کو اُٹھ بیٹھے۔ کچھ دیر اور سو لو۔ ابھی تو گڈو میاں تمھارا بائی فوکل لگائے اندھا بھینسا کھیل رہے ہیں! بالکل اپنے باپ پر پڑے ہیں۔" بچے سبھی کے ہوتے ہیں۔ مگر گھر کا گھروایا کہیں نہیں ہوتا۔ صبح دیکھو تو سگرٹ لائٹر کی لو پر ہنڈکلیا پکائی جا رہی ہے۔ شام کو خود بیگم صاحب گیلے بال بکھیرے پندرہ گز گھیر کی شلوار میں ہماری پنسل سے سٹ سٹ کمربند ڈال رہی ہیں۔

سُرخ چوڑیاں چھنکا کر سہاگ راگ چھیڑتے ہوئے بولیں، ہائے اللہ! دفتر کا غصّہ گھر والوں پہ کیوں اُتار رہے ہو؟ کسی نے تمھاری پنسل سے کمربند ڈالا ہو تو اس کے ہاتھ ٹوٹیں۔ میں نے تو تمھارے "پارکر" سے ڈالا تھا! چاہے جس کی قسم لے لو۔ رہے بچّے، تو اُن کے نصیب میں تمھاری استعمالی چیزیں ہی لکھی ہیں۔ پھر بھی آج تک ایسا نہیں ہوا کہ اُنھوں نے چیز واپس وہیں نہ رکھّی ہو۔ ہم نے کہا، یقین نہ ہو تو خود جا کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ لو سیفٹی ریزر کا بلیڈ غائب ہے۔ بولیں، کم از کم خدا سے تو ڈرو۔ ابھی ابھی میرے سامنے نبیلہ نے پنسل چھیل کر واپس ریزر میں لگایا ہے۔ وہ بچاری خود احتیاط کرتی ہے!

مرزا نے موضع چاکسو (خورد و کلاں) کے نیم بزرگوں کی انجمن کی داغ بیل ڈالی تو ہفتوں اس تذبذب میں رہے کہ نام کیا رکھّا جائے۔ پروفیسر قاضی عبدالقدّوس ایم۔اے (گولڈ میڈلسٹ) نے "انجمنِ افسردہ دلانِ چاکسو، رجسٹرڈ" تجویز کیا جو اس بناء پر مسترد کر دیا گیا کہ ممبری کا دار و مدار محض افسردہ دلی پر رکھا گیا تو چاکسو کے تمام شاعر مع غیر مطبوعہ دیوان گھس آئیں گے۔ خاصی بحث و تمحیص کے بعد طے پایا کہ اس غولِ کھولاں کا نام "بائی فوکل کلب" نہایت موزوں رہے گا کہ بائی فوکل ایک لحاظ سے تمام دُنیا کے ادھیڑوں کا قومی نشان ہے۔

انسان کی فطرت بھی ایک طُرفہ تماشا ہے۔ بوڑھا ہو یا بچّہ، نوجوان ہو یا ادھیڑ، آدمی ہر منزل پر اپنی عُمر کے باب میں جھوٹ ہی کو ترجیح دیتا ہے۔ لڑکے اپنی عُمر دو چار سال زیادہ بتا کر رُعب جماتے ہیں۔ یہی لڑکے جب نامِ خدا جوان ہو جاتے ہیں تو نوجوان کہلانا پسند کرتے ہیں۔ جو ادھیڑ مرد نسبتہً راست گو واقع ہوئے ہیں، وہ اپنی عُمر دس برس کم بتاتے ہیں۔ عورتیں البتّہ ہمیشہ سچ بولتی ہیں ـــــــ وہ ایک دوسرے کی عُمر ہمیشہ صحیح بتاتی

ہیں یہ حقیقت یہ ہے کہ خون، مشک، عشق اور ناجائز دولت کی طرح عمر بھی چھپائے نہیں چھپتی۔ بائی فوکل، السر، بدنظری، گاف، نئی نسل سے بیزاری، رقیق القلبی اور آسودہ حالی ——— یہ عمرِ وسطیٰ کی جانی پہچانی نشانیاں ہیں۔ ان سات صفات میں سے چھ کی بنا پر (یعنی، آسودہ حالی کو چھوڑ کر) جو ہماری ذات کے کوزے میں بند ہو گئی تھیں، ہمیں بلا مقابلہ بائی فوکل کلب کا سکریٹری جنرل منتخب کیا گیا۔

کلب کی رکنیت کی بنیادی شرط یہ ہے کہ آدمی چالیس سال کا ہو۔ اور اگر خود کو اس سے بھی زیادہ محسوس کرتا ہو تو کہنا ہی کیا۔ حضرتِ حفیظ جالندھری کے الفاظ میں یہ وہ عجب مرحلہ عمر ہے کہ آدمی کو

ہر بری بات، بری بات نظر آتی ہے!

یہ وہ دورِ عافیت ہے جب آدمی چاہے بھی تو نیکی کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ انڈونیشیا کے سابق صدر سوئیکارنو کا قول ہے کہ تیس بہاروں کے بعد ربر کا درخت اور بنتِ حوا کسی مصرف کے نہیں رہتے، جب کہ مرد کسی عمر میں حسن سے مامون نہیں۔ ایسے مقولے کی تردید یا تائید ہمارے بس کا کام نہیں۔ سوئیکارنو تو بزرگِ مردم دیدہ و زن گزیدہ ہونے کے علاوہ صدارت کے صدمے بھی اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہم تو ان سے بھی محروم ہیں۔ پھر یہ کہ چھوٹے منہ کو بری بات زیب بھی نہیں دیتی۔ ربر کے بارے میں ہم ابھی صرف اتنا دریافت کر پائے ہیں کہ غلطیوں کو مٹانے کے لیے خاصی کارآمد چیز ہے۔ رہی صنفِ نازک، سو اپنے محتاط و محدود مشاہدے کی بنا پر ہم کوئی خوبصورت جھوٹ نہیں بول سکتے۔ شیرنی کو کچھار میں کلیلیں کرتے دیکھنا اور بات ہے اور سرکس کے پنجرے میں بینڈ کی دھن پر لوٹیں لگاتے ہوئے دیکھنا اور بات۔

البتہ اپنے ہم جنسوں کے بارے میں بہت سے بہت کہہ سکتے ہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ سایہ سا ہیں کرتا ریگستان جو راتوں رات جیتی جیتی زمین کو نگلتا چلا جاتا ہے، وہ لق و دق صحرائے اعظم جو سن رسیدہ سینوں میں دمادم پھیلتا رہتا ہے، وہ کسی بھی لمحے نمودار ہو سکتا ہے کہ دل آنکھ سے پہلے بھی بوڑھے ہو جایا کرتے ہیں۔ اس ہُو کے صحرا میں گونج کے سوا کوئی صدا، کوئی ندا سنائی نہیں دیتی اور کیکٹس ★ کے سوا کچھ نہیں اُگتا۔ مرزا اس بنجر، بے رس، بے رنگ، بے اُمنگ دھرتی کو NO WOMAN'S LAND کہتے ہیں۔ جس کی ملی جلی سرحدیں صرف بائی فوکل سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ بڑھتے ہوئے سایوں اور بھینی بھینی یادوں کی سرزمین ہے جس کے باسی پیاس کو ترستے ہیں اور بے پیاس پیتے ہیں کہ انھیں

اس کا بھی مزا یاد ہے، اُس کا بھی مزا یاد

ایک دن ہمیں اُوپر کے شیشے سے صفحہ نمبر اور نچلے سے فٹ نوٹ پڑھتا دیکھ کر مرزا مُنہ اُوپر نیچے کر کے ہماری نقل اُتارنے لگے۔ حاضرین کو ہمارے حال پر خوب ہنسا چکے، تو ہم نے جل کر کہا، اچھا، ہم تو محض نیک چلنی کی وجہ سے قبل از وقت اندھے ہو گئے، لیکن تم کس خوشی میں یہ بوتل کے پیندے جتنی موٹی عینک چڑھائے پھرتے ہو؟

★ CACTUS (ناگ پھنی) کا پھول جتنا بڑا اور خوش رنگ ہوتا ہے، اُس سے زیادہ نازک سال بھر میں ایک بھبو کا پھول کھلتا ہے جو بس ایک رات اپنی بہار دکھا کر مرجھا جاتا ہے۔ دو دو سو سال پرانے ایسے کیکٹس بھی دیکھے گئے ہیں، جن میں دس برس بعد کہیں ایک پھول آتا ہے کہ سینۂ شب دہک اُٹھتا ہے۔ لیکن یہ بھی پچھلے پہر تک کمھلانے لگتا ہے:

آ جاؤ جو تم کو آنا ہو، ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

فرمایا، مگر یہ بائی فوکل نہیں ہے۔ ہم نے کہا، تو کیا ہُوا؟ جس عینک سے تم منہ اندھیرے تفسیرِ ماجدی کی ہِل ہِل کے تلاوت کرتے ہو، اُسی سے رات ڈھلے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے سَتر کُشا کیبرے دیکھتے ہو! فرمایا، برخوردار! اِسی لیے ہمارا دل آج تک سالم ہے!

اور یہ بڑی بات ہے۔ اِس لیے کہ مرزا (جو بیس سال سے خُود کو مرحُوم کہتے اور لکھتے آئے ہیں) اب تک چھوٹے بڑے ملاکر ۳۷ معاشقے کر چکے ہیں۔ ہر محبُوبہ کی یاد کو 'لیبل' لگا کر اِس طرح رکھ چھوڑا ہے جیسے فُٹ پاتھ پر مجمع لگا کے دوائیں بیچنے والے زہریلے سانپوں اور بِچھُّوؤں کو اِسپرٹ کی بوتلوں میں لیے پھرتے ہیں۔ اِن معاشقوں کا انجام وُہی ہُوا جو ہونا چاہیے، یعنی ناکامی۔ اور یہ اللہ نے بڑا فضل کیا، کیونکہ خدانخواستہ وُہ کامیاب ہو جاتے تو آج مرزا کے فلیٹ میں ۳۷ نفر دُلہنیں بیٹھی بلکہ کھڑی ہوتیں۔ لیکن پے در پے ناکامیوں سے مرزا کے پائے حماقت میں ذرا لغزش نہ آئی۔ دو چار ٹانگیں ٹوٹنے سے کھنکھجورا کہیں لنگڑا ہوتا ہے؟ ۳۲ ویں ناکامی کا البتّہ قلب نے بڑا اثر لیا۔ اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ راوی کے ریلوے پُل سے چھلانگ لگا کر خُودکشی کر لیں۔ لیکن اس میں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں پہلے ہی ٹرین سے نہ کٹ جائیں۔ متواتر تین چار شب دُوسرا سینما شو بھی اِس سوچے سمجھے منصُوبے کے تحت دیکھنے گئے کہ واپسی میں مال پر کوئی اُنھیں بے دردی سے قتل کر دے۔ لیکن کسی غُنڈے نے جاگتی جگمگاتی سڑک پر ان کے فاسد خُون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگے۔ ستم یہ کہ کسی نے وُہ جیب تک نہ کاٹی، جس میں وُہ حفاظتی پستول چھپا کر لے جاتے تھے۔ سب طرف سے مایُوس ہو کر اُنھوں نے حضرتِ داتا گنج بخش کی درگاہ کا رُخ کیا کہ اِسی کا مینار سب سے بلند اور قریب پڑتا تھا۔ مگر وہاں دیکھا کہ عُرس ہو رہا ہے۔ آدمیوں پر آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ موسم بھی کچھ نامناسب سا ہے۔

چنانچہ فی الحال ارادۂ ملتوی کر دیا اور بانو بازار سے چاٹ کھا کر واپس آ گئے۔

ذرا اتّفاق تو دیکھیے کہ دو دن بعد یہ مینار ہی گر گیا۔ مرزا نے اخبار میں خبر دیکھی تو سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔ بڑی حسرت سے کہنے لگے، صاحب! عجیب اتّفاق ہے کہ میں اس وقت مینار پر نہیں تھا۔ برسوں اس کا قلق رہا۔

اپنی اپنی فکر اور اپنی اپنی ہمّت کی بات ہے۔ ایک ہم ہیں کہ جو راتیں گناہوں سے توبہ و استغفار میں گزرنی چاہییں، وہ اب اُلٹی اُن کی حسرت میں ترستے پھڑکتے بیت رہی ہیں۔ نین کنول کھلے بھی تو پچھلے پہر کی چاندنی میں۔ اور ایک مرزا ہیں کہ نظر ہمیشہ نیچی رکھتے ہیں، لیکن حسینانِ شہر میں سے آج بھی کوئی سلوک کرے تو اس سے انکار نہیں۔ انہی کا قول ہے کہ آدمی بوالہوسی میں کمزوری یا کاہلی دکھلائے تو نری عاشقی رہ جاتی ہے ہم نے دیکھا کہ حالات کیسے ہی نامساعد ہوں، بلکہ اگر بالکل نہوت ہے، لیکن طبیعت حاضر ہے تو مرزا سنگلاخ چٹانوں سے جوئے شیر ہی نہیں، خود شیریں کو برآمد کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ بلکہ ایک آدھ دفعہ تو یہ چوٹ بھی ہوئی کہ کوہ کندن، کوہکن برآوردن! ۱۹۵۸ کا واقعہ ہے۔ ہمارے اصرار پر ایک بے بی شو (شیر خوار بچّوں کی نمائش) میں جج بننا منظور کیا اور وہاں ایک والدہ پر عاشق ہو گئے۔ پہلا انعام اسی کو دیا۔

۴ اگست ۶۶۔ دوپہر کا وقت۔ دن پہلے پیار کی مانند گرم۔ بدن کوری صراحی کی طرح رس رہا تھا۔ ہم گرد اڑاتے، خاک پھانکتے مرزا کو اکتالیسویں سالگرہ کی مبارکباد دینے گلبرگ پہنچے۔ مرزا کراچی سے نئے نئے لاہور آئے تھے اور مقامی 'کلر اسکیم' سے اس درجہ اختلاف تھا کہ سفیدے کے تنوں کو نیلا پینٹ کروا دیا تھا۔ ان کے بیرے نے برآمدے سے ہی ہانک لگائی کہ صاحب جی! وہ جو موٹر سائیکل رکشا کے آگے ایک چیز

لگی ہوتی ہے، صریچہ اُس پہ بیٹھ کے ایک صاحب ملنے آئے ہیں! لیکن مرزا نے نہ یہ اعلان سُنا اور نہ ہماری موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ، اس لیے کہ اس وقت وُہ سال گرہ کے مُرغّن لنچ کے بعد آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے کیس نمبر ۲۹ کو آغوشِ توجّہ میں لیے بیٹھے تھے۔ ہم نے شانہ جھنجھوڑ کر مداخلتِ بجا کرتے ہُوئے کہا، مرزا! عجیب بات ہے۔ ہر سالگرہ ہماری عینک کے نمبر اور بے دلی میں اضافہ کر جاتی ہے اور ہمیں ہر شے میں ایک تازہ دراڑ پڑی نظر آتی ہے۔ مگر تم ہو کہ آج بھی ستاروں پہ کمند ڈالنے کا حوصلہ رکھتے ہو۔ بولے، شکریہ! نطشے کا فیضان ہے۔ ہم نے کہا، مگر ہمارا مطلب فلمی ستاروں سے تھا! فوراً شکریہ واپس لیتے ہُوئے فرمایا "...ET TU, BRUTUS?"

دو چار برس کی بات نہیں، ہم نے مرزا کا وُہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب

گھنگھور گھٹا تُلی کھڑی تھی

پر بُوند ابھی نہیں پڑی تھی

ابھی وُہ اس لائق بھی نہیں تھے کہ اپنے ٹوئیاں طوطے کی کفالت کر سکیں، لیکن دلِ ناصبُور کا یہ رنگ تھا کہ الجبرا کے گھنٹے میں بڑی محویّت سے اپنے ہاتھ کی ریکھاؤں کا مطالعہ کرتے رہتے۔ عُمر کی لکیر اُن کی ذاتی ضرورت سے کچھ لمبی ہی تھی۔ مگر شادی کی فقط ایک ہی لائن تھی، جسے رگڑ رگڑ کے دیکھتے تھے کہ شاید پچھلے چوبیس گھنٹوں میں کوئی شاخ پھوٹی ہو۔ مدت العمر متعدد خاندانی بزرگ اُن کی جوانی پر سایہ فگن رہے۔ بارے اُن کے گھنے گھنے سائے سر سے اُٹھے تو پتہ چلا کہ دُنیا اتنی بُری جگہ نہیں۔ لیکن ایک مدت تک مالی حالات نے رُخصتِ آوارگی نہ دی اور جی مار مار کے رہ گئے۔ ورنہ ان کا بس چلتا تو بچی کھُچی متاعِ عُمر کو اس طرح ٹھکانے لگا دیتے، جیسے دلّی کے بادشاہ لدے پھندے باغ لونڈیوں سے

لٹوا دیا کرتے تھے۔ مرزا ۱۹۴۸ تک مرزایانہ بسر کرتے رہے۔ یعنی مزاج رئیسانہ اور آمدنی فقیرانہ رکھتے تھے۔ شادی کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ خدا بھلا کرے پروفیسر قاضی عبدالقدوس کا جنھوں نے ایک دن اپنی ہتھیلی پر قلم سے ضرب تقسیم کر کے مرزا کو اعداد و شمار سے قائل کر دیا کہ جتنی رقم وہ سگرٹوں پر پھونک چکے ہیں، اس سے سگھڑ شوہر چار دفعہ مہر بیباق کر سکتا تھا۔ آخر ہم سب نے لگ لپٹ کر ان کی شادی کروا دی۔ دو چار دن تو مہرِ معجّل کی دہشت سے سہمے سہمے پھرے اور جیسے تیسے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا، لیکن ہنی مون کا ہفتہ ختم ہونے سے پہلے اس حد تک نارمل ہو گئے کہ بے تکلف دوستوں کو چھوڑیے، خود نئی نویلی دلھن کی زبان پر بھی یوں ہی کوئی زنانہ نام آ گیا تو مرزا تڑپ کر مجسّم سوال نامہ بن گئے:

کہاں ہے؟ کس طرح کی ہے؟ کدھر ہے؟

انھی کے ایک برادرِ نسبتی سے روایت ہے کہ عین آرسی مصحف کے وقت بھی آئینے میں اپنی دلھن کا منہ دیکھنے کے بجائے مرزا کی نگاہیں اس کی ایک سہیلی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ دنیا گواہ ہے (دنیا سے یہاں ہماری مراد وہی ہے، جو مرزا کی یعنی عالمِ نسواں) کہ مرزا نے جس پہ ڈالی، بری نظر ڈالی، سوائے اپنی بیوی کے۔ موصوف کا اپنا بیان ہے کہ بندہ شیرخوارگی کے عالم میں بھی بیس سال سے زیادہ عمر کی آیا کی گود میں نہیں جاتا تھا۔ کبھی کبھی اپنی ندیدی آنکھوں سے خود پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ زکام کے سہ ماہی حملے کے دوران ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کئی بار وصیت کر چکے ہیں کہ میں مرنے لگوں تو للہ ایک گھنٹہ پہلے میری عینک اُتار دینا، ورنہ میرا دم نہیں نکلے گا۔ ہم نے ایک دفعہ پوچھا مرزا ہمیں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ تمہارے دشمنوں کے مرنے میں اب ایک گھنٹہ رہ گیا ہے؟ بولے

جب میں نرس سے ڈیوٹی کے بعد کا فون نمبر پوچھنے کے بجائے اپنا ٹمپریچر پوچھنے لگوں، تو سمجھ لینا کہ تمھارے یارِ جانی کا وقت آن لگا ہے!

مگر مرزا کی باتیں ہی باتیں ہیں۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ ان کے سینے میں جو بانکا سجیلا ڈان وان ڈھوم مچایا کرتا تھا، وہ اب پچھلے پہر دُہرا ہو ہو کر کھانسنے لگا ہے۔ اب وہ آتش دان کے سامنے کمبل کا گھونگٹ نکالے کپکپاتی آواز میں اپنے نیاز مندوں کو اس عہدِ رنگیں کی داستانیں سناتے ہیں جب وہ علی الصبح FRIDGE کے پانی سے نہایا کرتے تھے۔ وہ تو یہاں تک شیخی مارتے ہیں کہ آج کل کے مقابلے میں اُس زمانے کی طوائفیں کہیں زیادہ بدچلن ہُوا کرتی تھیں۔

مرزا کا ذکر، اور پھر بیاں اپنا! سمجھ میں نہیں آتا کس دل سے ختم کریں۔ لیکن کلب کے سرپرستِ اعلیٰ فہیم اللہ خاں کا تعارف رہا جاتا ہے۔ یہ انھی کے دم قدم بلکہ دام و درم کا ظہور ہے جس نے چالیس خورد و کلاں کے تمام ادھیڑوں کو بغیر کسی مقصد کے ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ خاں صاحب ہر نسل کی امریکی کار اور گھوڑوں کے دلدادہ ہیں۔ آخر الذکر کی رفتار و کردار سے اتنے متاثر ہیں کہ کسی حسین خاتون کی انتہائی تعریف کرنی مقصود ہو تو اسے گھوڑی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اوروں پر بہت ہُوا تو رزق کا ایک دروازہ کھل جاتا ہے۔ ان پر پوری بارہ دری کھلی ہوئی ہے۔ اور وہ بھی روزِ اوّل سے ورنہ ہونے کو تو فارغ البالی ہمیں بھی نصیب ہوئی، مگر بقولِ شاعر

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

ہم جب چوتھی جماعت میں پہنچے تو اُن کے بڑے صاحبزادے میٹرک میں دوسری دفعہ فیل ہو چکے تھے۔ لیکن پیری کا احساس تو کجا، جب سے ہم نے بائی فوکل

لگایا ہے، ہمیں اپنی تازہ ترین یعنی ماہ رداں کی منظورِ نظر سے "انکل" کہلوا کر حسینوں کی نگاہ میں ہماری عزت اور عمر بڑھاتے ہیں۔ جس مقام پر ہم اب لاحول پڑھنے لگ گئے ہیں، وہاں ان کی زبان ابھی تک سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے سوکھی جاتی ہے۔

ہم نے ان کی جوانی کی گرمیاں نہیں دیکھیں۔ ہاں، بڑے بوڑھوں سے سُنا ہے کہ جب موصوف کی جوانی محلّے کی دوشیزاؤں کے والدین پر گراں گزرنے لگی تو انھوں نے ہمسایوں کے در و دیوار پہ حسرت سے نظر کر کے چاکسو خورد کو خیرباد کہا اور بمبئی کا رُخ کیا، جہاں اُدن کی آڑھت کے ساتھ ساتھ ۱۹۴۷ تک کئی اونچے گھرانوں کی روشن خیالی پر متصرّف رہے۔ مرزا کا کہنا ہے کہ ان کا دل شروع ہی سے بہت بڑا تھا۔ ان کا مطلب ہے کہ اس میں بیک وقت کئی مستورات کی سمائی ہو سکتی تھی۔ خوب سے خوب تر کی جستجو انھیں کئی بار قاضی کے سامنے بھی لے گئی۔ اور ہر طرح پہ پھر پھر کے جوانی آئی کہ یہ

عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لیے

اُن کے قہقہے میں جو گونج اور گمک ہے، وہ سندھ کلب کے انگریزوں کی صحبت اور وہیں کی وہسکی سے کشید ہوتی ہے۔ خوش باش، خوش لباس، شاہ خرچ۔ ناجائز آمدنی کو انھوں نے ہمیشہ ناجائز مد میں خرچ کیا۔ طبیعت دھوپ گھڑی کی مانند جو صرف روشن ساعتوں کا شمار رکھتی ہے۔ قوی ہیکل، چوڑی چھاتی، کھڑی کمر، کندھے جیسے خربوزے کی پھانک، کھلتی برستی جوانی۔ اور آنکھیں؟ ادھر دو تین سال سے عینک لگانے لگے ہیں، مگر دھوپ کی۔ وہ بھی اُس وقت جب سینڈز پٹ کے لباس دشمن ساحل پر غسلِ آفتابی کے نظارے سے ان کی گدلی گدلی آنکھوں میں ایک ہزار "اسکنڈل پاور"

کی چمک پیدا ہو جاتی ہے اور وہ گھنٹوں کسی کو نظروں سے غسل دیتے رہتے ہیں۔ پاس کی نظر ایسی کہ اب تک اپنی جوان جہان پوتیوں کے نام کے خط کھول کر بغیر عینک کے پڑھ لیتے ہیں۔ رہی دُور کی نظر، سو جتنی دُور نارمل آدمی کی نظر جا سکتی ہے، اتنی دُور بُری نظر سے دیکھتے ہیں۔

۱۹۶۵ — ۱۹۶۸ء

چند تصویرِ بُتاں

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے .....

رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی نے اپنی شاعری کے تین رنگ بتائے ہیں۔ فاسقانہ، عاشقانہ اور عارفانہ۔ مولانا کی طرح چکّی کی مشقت تو بڑی بات ہے، مرزا عبدالودود بیگ نے تو مشقِ سخن سے بھی ذہن کو گراں بار نہیں کیا۔ تاہم وہ بھی اپنے فن (فوٹوگرافی) کو انہی تین مہلک ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اُن کے یہاں یہ ترتیب بالکل اُلٹی ہے۔ رہا ہمارا معاملہ، تو ابھی ہم رُوسو کی طرح اتنے بڑے آدمی نہیں ہوئے کہ اپنے اُوپر علانیہ فسق و فجور کی تہمت لگانے کے بعد بھی اپنے اور پولیس کے درمیان ایک باعزت فاصلہ قائم رکھ سکیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ مرزا کی طرح ہم بھی ہلاکِ فن ہیں اور ہمارا ناتا بھی اس فن سے اتنا ہی پُرانا ہے کیونکہ جہاں تک یاد پڑتا ہے تختی پر "قلم گوید کہ من شاہِ جہانم" لکھ لکھ کر خود کو گمراہ کرنے سے پہلے ہم کوڈک براؤنی کیمرے کا بٹن دبانا سیکھ چکے تھے۔ لیکن جس دن سے مرزا کی ایک ننگی کھلی تصویر (جسے وہ فگر اسٹڈی کہتے ہیں) کو لندن کے ایک رسالے نے زیورِ طباعت سے آراستہ کیا ہماری بے ہُنری کے نئے نئے پہلو اُن پر منکشف ہوتے رہتے ہیں۔

مرزا جب سے بولنا سیکھے ہیں، اپنی زبان کو ہماری ذات پر ورزش کراتے رہتے ہیں اور اکثر تلمیح و استعارے سے معمولی گالی گلوج میں ادبی شان پیدا کر دیتے ہیں۔ ابھی [illegible] کی با

ہے۔ کہنے لگے، یار! بُرا نہ ماننا۔ تمہارے فن میں کوئی کرونٹ، کوئی پیچ، میرا مطلب ہے کوئی موڑ نظر نہیں آتا۔ ہم نے کہا، پلاٹ تو اُردو ناولوں میں ہوا کرتا ہے۔ زندگی میں کہاں؟ بولے ہاں، ٹھیک کہتے ہو۔ تمہاری عکاسی بھی تمہاری زندگی ہی کا عکس ہے۔ یعنی اوّل تا آخر خواری کا ایک ناقابلِ تقلید اسلوب!

ہر چند کہ یہ کمال نے نوازی ہمارے کچھ کام نہ آیا۔ لیکن یہی کیا کم ہے کہ مرزا جیسے فرزانے کان پکڑتے ہیں اور ہماری حقیر زندگی کو اعلیٰ تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں یعنی اسے سامنے رکھ کر اپنی اولاد کو عبرت دلاتے ہیں، تنبیہ و فہمائش کرتے ہیں۔ ان صفحات میں ہم اپنے اسلوبِ حیات کی توجیہہ و تشریح کر کے پڑھنے والوں کے ہاتھ میں کلیدِ ناکامی نہیں دینا چاہتے۔ البتہ اتنا ضرور عرض کریں گے کہ مرزا کی طرح ہم اپنی نالائقی کو ارتقائی ادوار میں تقسیم تو نہیں کر سکتے، لیکن جو حضرات ہمارے شوقِ منفعل کی داستان پڑھنے کی تاب رکھتے ہیں، وہ دیکھیں گے کہ ہم سدا سے حاجیوں کے پاسپورٹ فوٹو اور تاریخی کھنڈروں کی تصویریں ہی نہیں کھینچتے رہے ہیں۔

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی

لیکن ہم کس شمار قطار میں ہیں۔ مرزا اپنے آگے بڑے بڑے فوٹوگرافروں کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ ایک دن ہم نے پوچھا، مرزا! دنیا میں سب سے بڑا فوٹوگرافر کون ہے؟ یوسف کارش یا سیسل بیٹن؟ مسکراتے ہوئے بولے، تم نے وہ حکایت نہیں سنی؟ کسی نادان نے مجنوں سے پوچھا، خلافت پر حق حضرت حسینؑ کا ہے یا یزید لعین کا؟ بولا، اگر سچ پوچھو تو لیلیٰ کا ہے!

ادھر چند سال سے ہم نے یہ معمول بنا لیا ہے کہ ہفتہ بھر کی اعصابی شکست و ریخت

کے بعد اتوار کو مکمل "سبت" مناتے ہیں۔ اِدھر سنیچر کی سہ پہر تقریباً شام سے سوموار کی صبح آٹھ بجے تک ہر وہ فعل اپنے اُوپر حرام کر لیتے ہیں جس میں کام کا ادنیٰ شائبہ یا کمائی کا ذرا بھی اندیشہ ہو۔ چھ دن دُنیا کے، ایک دن اپنا۔ (مرزا تو اتوار کے دن اتنا آزاد اور کھلا کھلا محسوس کرتے ہیں کہ فجر کی نماز کے بعد دُعا نہیں مانگتے۔ اور پیر کے تصور سے اُن کا جی اتنا الجھتا ہے کہ ایک دن کہنے لگے، اتوار اگر پیر کے دن ہُوا کرتا، تو کیا ہی اچھا ہوتا!) یہ بات نہیں کہ ہم محنت سے جی چراتے ہیں۔ جس شغل (فوٹوگرافی) میں اتوار گزرتا ہے، اُس میں محنت تو اتنی ہی پڑتی ہے جتنی دفتری کام میں۔ لیکن فوٹوگرافی میں دماغ بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اور "ماڈل" اگر نچلے نہ بیٹھنے والے بچے ہوں تو نہ صرف زیادہ بلکہ بار بار استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اِس سے بچنے کے لیے مرزا نے اب ہمیں چند اُستادانہ گُر سکھا دیے ہیں۔ مثلاً ایک تو یہی کہ پرندوں اور بچّوں کی تصویر کھینچتے وقت صرف آنکھ پر فوکس کرنا چاہیے کہ ان کی ساری شخصیت کھنچ کر آنکھ کی چمک میں آجاتی ہے۔ اور جس دن اُن کی آنکھ میں یہ چمک نہ رہی، دُنیا اندھیر ہو جائے گی۔ دُوسرے یہ کہ جس بچے پر تمھیں پیار نہ آئے، اس کی تصویر ہرگز نہ کھینچو۔ فرانس میں ایک نفاست پسند مصوّر گزرا ہے جو نجیب الطرفین گھوڑوں کی تصویریں پینٹ کرنے میں یدِ طُولیٰ رکھتا تھا۔ نشاطِ فن اسے اس درجہ عزیز تھا کہ جو گھوڑا دوغلا یا بیس ہزار فرینک سے کم قیمت کا ہو، اُس کی تصویر ہرگز نہیں بناتا تھا، خواہ اس کا مالک بیس ہزار محنتانہ ہی کیوں نہ پیش کرے۔

مہینہ یاد نہیں رہا۔ غالباً دسمبر تھا۔ دن البتّہ یاد ہے، اس لیے کہ اتوار تھا۔ اور مذکورۂ بالا زرّیں اُصولوں سے لیس، ہم اپنے اُوپر ہفتہ وار خود فراموشی طاری کیے ہوئے تھے کہ گھر میں ہمارے عزیز ہمسائے کی بچّی ناجیہ، اپنی سیفو (سیامی بلّی) کی قدِ آدم تصویر کھنچوانے آئی ہوئی تھی۔ قدِ آدم سے مراد شیر کے برابر تھی۔ کہنے لگی، "انکل! جلدی سے ہماری بلّی کا فوٹو کھینچ دیجیے

ہم اپنی گڑیا کو اکیلا چھوڑ آتے ہیں۔ کل صبح سے بچاری کے پیٹ میں درد ہے۔ جبھی تو کل ہم اسکول نہیں گئے۔" ہم نے جھٹ پٹ کیمرے میں تیز رفتار فلم ڈالی۔ تینوں "فلڈ لیمپ" ٹھکانے سے اپنی اپنی جگہ رکھے۔ پھر بلی کو دبوچ دبوچ کے میز پر بٹھایا۔ اور اس کے منہ پر مسکراہٹ لانے کے لیے ناجیہ پلاسٹک کا چوہا ہاتھ میں پکڑے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہم بٹن دبا کر $\frac{1}{100}$ سیکنڈ میں اس مسکراہٹ کو بقائے دوام بخشنے والے تھے کہ پھاٹک کی گھنٹی اس زور سے بجی کہ سیفو اچھل کر کیمرے پر گری اور کیمرہ قالین پر۔ ہر دو کو اسی حالت میں چھوڑ کر ہم ناوقت آنے والوں کے استقبال کو دوڑے۔

حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

پھاٹک پر شیخ محمد شمس الحق کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ان کے پہلو سے روئی کے دگلے میں ملفوف و مستور ایک اور بزرگ برآمد ہوئے، جن پر نظر پڑتے ہی ناجیہ تالی بجا کے کہنے لگی:

"ہائے! کیا کیوٹ سینٹا کلاز ہے!"

یہ شیخ محمد شمس الحق کے ماموں میاں قبلہ نکلے، جو حج کو تشریف لے جا رہے تھے اور ہمیں ثوابِ دارین میں شریک کرنے کے لیے موضع چاکسو (خورد) سے اپنا پاسپورٹ فوٹو کھنچوانے آئے تھے۔

"ماموں میاں تو بضد تھے کہ فوٹوگرافر کے پاس لے چلو۔ بلا سے پیسے لگ جائیں، تصویر تو ڈھنگ کی آئے گی۔ بڑی مشکلوں سے رضامند ہوئے ہیں یہاں آنے پر" انھوں نے شانِ نزول مع اجلال بیان کی۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی شیخ محمد شمس الحق صاحب کے ماموں جان قبلہ دیواروں پر قطار اندر قطار آویزاں تصویرِ بُتاں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے لگے۔ ہر تصویر کو دیکھنے کے بعد مُڑ کر ایک دفعہ ہماری صُورت ضرُور دیکھتے۔ پھر دُوسری تصویر کی باری آتی۔ اور ایک دفعہ پھر ہم پر وُہ نگاہ ڈالتے، جو کسی طرح غلط انداز نہ تھی۔ جیسی نظروں سے وہ یہ تصویریں دیکھ رہے تھے، اُن سے ظاہر ہوتا تھا کہ صاحبِ نظر کا تعلق اُس نسل سے ہے جس نے کلدار رُوپے پر بنی ہوئی ملکہ وکٹوریہ کے بعد کسی عورت کی تصویر نہیں دیکھی۔ ایک بانکی سی تصویر کو ذرا قریب جاکر دیکھا۔ لاحول پڑھی۔ اور پُوچھا، یہ آپ کے لڑکے نے کھینچی ہے؟ عرض کیا، جی، نہیں! وہ تو تین سال سے ساتویں میں پڑھ رہا ہے۔ بولے، ہمارا بھی یہی خیال تھا، مگر احتیاطاً پُوچھ لیا۔

شیخ محمد شمس الحق صاحب کے ماموں جان قبلہ (اپنی اور کاتب کی سہُولت کے مدِّنظر آیندہ انھیں فقط 'ماموں' لکھا جائے گا۔ جن قارئین کو ہمارا اِختصار ناگوار گزرے، وہ ہر دفعہ 'ماموں' کے بجائے 'شیخ محمد شمس الحق صاحب کے ماموں جان قبلہ' پڑھیں) ہماری رہبری کے لیے اپنے تایا ابّا مرحوم کی ایک مٹی مٹائی تصویر ساتھ لائے تھے۔ شیشم کے فریم کو حنائی انگوچھے سے جھاڑتے ہوئے بولے "ایسی کھینچ دیجیے۔" ہم نے تصویر کو غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ ماموں کے عمِّ بزرگوار بھی وہی رُوئی کا دُگلا پہنے کھڑے ہیں، جس پر اُلٹی کیریاں بنی ہوئی ہیں۔ تلوار کو بڑی مضبُوطی سے پکڑ رکھا ہے ———— جھاڑو کی طرح۔ عرض کیا، قبلہ! پاسپورٹ فوٹو میں تلوار کی اجازت نہیں۔ فرمایا، آپ کو ہمارے ہاتھ میں تلوار نظر آرہی ہے؟ ہم بہت خفیف ہوئے۔ اِس لیے کہ ماموں کے ہاتھ میں واقعی کچھ نہ تھا۔ بجز ایک بے ضرر گلاب کے، جسے سُونگھتے ہوئے وہ پاسپورٹ فوٹو کھنچوانا چاہتے تھے۔

ماموں کے کان 'ط' کی مانند تھے ——— باہر کو نکلے ہوئے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم جسمانی عیوب کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ درحقیقت اس تشبیہ سے ہمیں کانوں کی افادیت دکھانی مقصود ہے۔ کیونکہ خدانخواستہ کانوں کی ساخت ایسی نہ ہوتی تو اُن کی ترکی ٹوپی سارے چہرے کو ڈھانک لیتی۔ ابتدائی تیاریوں کے بعد بڑی منتوں سے انھیں فوٹو کے لیے کرسی پر بٹھایا۔ کسی طرح نہیں بیٹھتے تھے۔ کہتے تھے "بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کھڑے رہیں اور میں بیٹھ جاؤں"۔ خدا خدا کر کے وہ بیٹھے تو ہم نے دیکھا کہ اُن کی گردن ہلتی ہے۔ ظاہر ہے، ہمیں فطری رعشے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اصل مصیبت یہ تھی کہ گردن اگر دو سیکنڈ ہلتی تو ٹوپی کا پھندنا دو منٹ تک ہلتا رہتا۔ ہر دو عمل کے ایک نایاب وقفے میں ہم نے "ریڈی" کہا تو گویا عالم ہی کچھ اور تھا۔ ایک دم اکڑ گئے اور ایسے اکڑے کہ جسم پر کہیں بھی ہتھوڑی مار کر دیکھیں تو ٹن ٹن آواز نکلے۔ ڈیڑھ دو منٹ بعد تیسری دفعہ "ریڈی" کہہ کر کیمرے کے دیدبان (VIEW-FINDER) سے دیکھا تو چہرے سے خوف آنے لگا۔ گردن پر ایک رسّی جیسی رگ نہ جانے کہاں سے اُبھر آئی تھی۔ چہرہ لال۔ آنکھیں اُس سے زیادہ لال۔ یکلخت ایک عجیب آواز آئی۔ اگر ہم اُن کے منہ کی طرف نہ دیکھ رہے ہوتے تو یقیناً یہی سمجھتے کہ کسی نے سائیکل کی ہوا نکال دی ہے۔

"اب تو سانس لے لوں؟" سارے کمرے کی ہوا اپنی ناک سے پمپ کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔ اب سوال یہ نہیں تھا کہ تصویر کیسی اور کس پوز میں کھینچی جائے۔ سوال یہ تھا کہ ان کا عملِ تنفس کیوں کر برقرار رکھا جائے کہ تصویر بھی کھنچ جائے اور ہم قتلِ عمد کے مرتکب بھی نہ ہوں۔ اپنی نگرانی میں انھیں دو چار ہی سانس دلواتے تھے کہ مسجد سے مؤذن کی صدا بلند ہوئی۔ اور پہلی "اللہ اکبر" کے بعد، مگر دوسری سے پہلے، ماموں کرسی سے تڑپڑا

کے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ شیشے سے جگ سے وضو کیا۔ پوچھا، قبلہ کس طرف ہے؟ ہمارے منہ سے نکل گیا کہ مغرب کی طرف۔ فرمایا، ہمارا بھی یہی خیال تھا، مگر احتیاطاً پوچھ لیا۔ اس کے بعد جانماز طلب کی۔

ماموں نے پلنگ پر بیٹھ کر ظہر کی نماز قائم کی۔ آخر میں بآوازِ بلند دعا مانگی، جسے وہ لوگ جن کا ایمان ہم سے ضعیف ہو، فرمائشوں کی فہرست کہہ سکتے ہیں۔ نماز سے فارغ ہوئے تو ہمیں مخاطب کرکے بڑی نرمی سے بولے "چار فرضوں کے بعد دو سنتیں پڑھی جاتی ہیں۔ تین سنتیں کسی نماز میں نہیں پڑھی جاتیں۔ کم از کم مسلمانوں میں!"

دوسرے کمرے میں طعام و قیلولہ کے بعد چاندی کی خلال سے حسبِ عادتِ قدیم اپنے مصنوعی دانتوں کی ریخیں کریدتے ہوئے بولے "بیٹا! تمھاری بیوی بہت سگھڑ ہے۔ گھر بہت ہی صاف ستھرا رکھتی ہے۔ بالکل ہسپتال لگتا ہے"۔ اس کے بعد ان کی اور ہماری مشترکہ جانکنی پھر شروع ہوئی۔ ہم نے کہا "اب تھوڑا ریلیکس (RELAX) کیجیے"۔ بولے، "کہاں کروں؟" کہا "میرا مطلب ہے بدن ذرا ڈھیلا چھوڑ دیجیے۔ اور یہ بھول جائیے کہ آپ کیمرے کے سامنے بیٹھے ہیں"۔ بولے "اچھا! یہ بات ہے!" فوراً بندھی ہوئی مٹھیاں کھول دیں۔ آنکھیں جھپکائیں اور پھیپھڑوں کو اپنا قدرتی فعل پھر شروع کرنے کی اجازت دی۔ ہم نے اس "نیچرل پوز" سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے دوڑ دوڑ کر ہر چیز کو آخری "ٹچ" دیا، جس میں یہ بندھا ٹکا فقرہ بھی شامل تھا "اِدھر دیکھیے۔ میری طرف۔ ذرا مسکرائیے!" بٹن دبا کر ہم "شکریہ" کہنے والے تھے کہ یہ دیکھ کر ایرانی قالین پیروں تلے سے نکل گیا کہ وہ ہمارے کہنے سے پہلے ہی خدا جانے کب سے ریلیکس کرنے کی غرض سے اپنی بتیسی ہاتھ میں لیے ہنسے چلے جا رہے تھے۔ ہم نے کہا "صاحب! اب نہ ہنسیے! بولے "تو پھر آپ سامنے سے ہٹ جائیے!"

ہمیں اُن کے سامنے سے ہٹنے میں زیادہ سوچ بچار نہیں کرنا پڑا۔ اسی لیے کہ اسی وقت ننھّی ناجیہ دَوڑی دَوڑی آئی اور ہماری آستین کا کونا کھینچتے ہوئے کہنے لگی "انکل اباہری اپ! پلیز! جانماز پہ بلّی پنجوں سے وضو کر رئی ہے! ہائے اللہ! بڑی کیوٹ لگ رئی ہے!"

پھر ہم اس منظر کی تصویر کھینچنے اور ماموں لاحول پڑھنے لگے۔

اگلے اتوار کو ہم پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے فوٹو کی "ری ٹچنگ" میں جُتے ہوئے تھے۔ پتلون کی پندرھویں سلوٹ پر کلف استری کر کے ہم اب ہونٹ کا مسّا چھپانے کے لیے صفر نمبر کے برش سے مونچھ بنانے والے تھے کہ اتنے میں ماموں اپنی تصویریں لینے آدھمکے۔ تصویریں کیسی آئیں، اس کے متعلّق ہم اپنے منہ سے کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ مکالمہ خود چیاخ پکار بول اُٹھے گا:

"ہم ایسے ہیں؟"

"کیا عرض کروں!"

"تمھیں کس نے سکھایا تصویر کھینچنا؟"

"جی! خود ہی کھینچنے لگ گیا۔"

"ہمارا بھی یہی خیال تھا۔ مگر احتیاطاً پوچھ لیا۔"

"آخر تصویر میں کیا خرابی ہے؟"

"ہمارے خیال میں یہ ناک ہماری نہیں ہے۔"

ہم نے اُنھیں مطّلع کیا کہ اُن کے خیال اور اُن کی ناک میں کوئی مطابقت نہیں ہے۔ اس پر اُنھوں نے یہ جاننا چاہا کہ اگر تصویر کو خوب بڑا کیا، تب بھی ناک چھوٹی نظر آئے گی کیا؟

پندِ سُود مند

دُوسرے دن مرزا ایک نئی طرز کے ہوٹل "مانٹی کارلو" کے بال رُوم میں اُتاری ہُوئی تصویریں دکھلانے آئے۔ اور ہر تصویر پر ہم سے اس طرح داد وُصول کی جیسے مرہٹے چوتھ وُصول کیا کرتے تھے۔ یہ اسپین کی ایک اسٹرپ ٹیز ڈانسر (جسے مرزا اُندلُسی رقاصہ کہے چلے جارہے تھے) کی تصویریں تھیں، جنھیں برہنہ تو نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس لیے کہ سفید دستانے پہنے ہُوئے تھی۔ گرم کافی اور تحسین ناشناس سے ان کی طبیعت میں انشراح پیدا ہونے لگا تو موقع غنیمت جان کر ہم نے ماموں کی زیادتیاں گوش گزار کیں اور مشورہ طلب کیا۔ اب مرزا میں بڑی پُرانی کمزوری یہ ہے کہ اُن سے کوئی مشورہ مانگے تو ہاں میں ہاں ملانے کے بجائے سچ مچ مشورہ ہی دینے لگ جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہماری صُورت میں کوئی ایسی بات ضرور ہے کہ ہر شخص کا بے اختیار نصیحت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ چُنانچہ پھر شرُوع ہو گئے:

"صاحب! آپ کو فوٹو کھینچنا آتا ہے، فوٹو کھنچوانے والوں سے نمٹنا نہیں آتا۔ سلامتی چاہتے ہو تو کبھی اپنے سامنے فوٹو دیکھنے کا موقع نہ دو۔ بس دبیز لفافے میں بند کرکے ہاتھ میں تھما دو اور چلتا کرو۔ وکٹوریہ روڈ کے چوراہے پر جو فوٹوگرافر ہے۔ لہسنیا ڈاڑھی والا۔ ارے بھئی! وُہی جس کی ناک پر چاقو کا نشان ہے۔ آگے کا دانت ٹُوٹا ہُوا ہے۔ اب اُس نے بڑا پیارا اصُول بنا لیا ہے۔ جو گاہک دُکان پر اپنی تصویر نہ دیکھے، اُسے بل میں ۲۵ فی صد نقد رعایت دیتا ہے۔ اور ایک تم ہو کہ مُفت تصویر کھینچتے ہو۔ اور شہر بھر کے بدصُورتوں سے گالیاں کھاتے پھرتے ہو۔ آج تک ایسا نہیں ہُوا کہ تم نے کسی کی تصویر کھینچی ہو اور وہ ہمیشہ کے لیے تمھارا جانی دُشمن نہ بن گیا ہو۔"

کثرتِ اولاد اور بیہ فقیر پُرتقصیر

نصیحت کی دُھن میں مرزا یہ بھول گئے کہ دشمنوں کی فہرست میں اضافہ کرنے میں خود انھوں نے ہمارا کافی ہاتھ بٹایا ہے۔ جس کا اندازہ اگر آپ کو نہیں ہے تو آنے والے واقعات سے ہو جائے گا۔ ہم سے کچھ دور پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے ایک نامی گرامی ٹھیکیدار ٹین کو ٹھیوں میں رہتے ہیں۔ مارشل لار کے بعد سے بچارے اتنے رقیق القلب ہو گئے ہیں کہ برسات میں کہیں سے بھی چھت گرنے کی خبر آئے، ان کا کلیجہ دھک سے رہ جاتا ہے۔ حلیہ ہم اس لیے نہیں بتائیں گے کہ اسی بات پر مرزا سے بری طرح ڈانٹ کھا چکے ہیں ——— "ناک فلپس کے بلب جیسی، آواز میں بنک بیلنس کی کھنک، جسم خوبصورت صراحی کی مانند ——— یعنی وسط سے پھیلا ہوا ———" ہم نے آؤٹ لائن ہی بنائی تھی کہ مرزا گھایل لہجے میں بولے، "بڑے مزاح نگار بنے پھرتے ہو۔ تمھیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ جسمانی نقائص کا مذاق اڑانا طنز و مزاح نہیں"۔ کروڑپتی ہیں، مگر انکم ٹیکس کے ڈر سے اپنے کو لکھ پتی کہلواتے ہیں۔ مبدءِ فیاض نے ان کی طبیعت میں کنجوسی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ روپیہ کمانے کو تو سبھی کماتے ہیں۔ وہ رکھنا بھی جانتے ہیں۔ کہتے ہیں، آمدنی بڑھانے کی سہل ترکیب یہ ہے کہ خرچ گھٹا دو۔ مرزا سے روایت ہے کہ انھوں نے اپنی بڑی بیٹی کو اس وجہ سے جہیز نہیں دیا کہ اس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی، جو خود لکھ پتی تھا۔ اور دوسری بیٹی کو اس لیے نہیں دیا کہ اس کا دولھا دیوالیہ تھا۔ سال چھ مہینے میں ناک کی کیل تک بیچ کھاتا۔ غرضکہ لکشمی گھر کی گھر میں رہی۔

ہاں، تو انہی ٹھیکیدار صاحب کا ذکر ہے، جن کی جائدادِ منقولہ وغیر منقولہ، منکوحہ وغیر منکوحہ کا نقشہ شاعرِ شیوہ بیاں نے ایک مصرع میں کھینچ کر رکھ دیا ہے:

ایک اک گھر میں سَو سَو کمرے ہر کمرے میں نار

اس حسین صورتِ حال کے نتائج اکثر ہمیں بھگتنے پڑتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ ہر نو مولود کے عقیقہ اور پہلی سالگرہ پر ہمیں سے یادگار تصویر کھنچواتے ہیں۔ اور یہی کیا کم ہے کہ ہم سے کچھ نہیں لیتے۔ اِدھر ڈھائی تین سال سے اتنا کرم اور فرمانے لگے ہیں کہ جیسے ہی خاندانی منصوبہ شکنی کی شبھ گھڑی قریب آتی ہے تو ایک نوکر دائی کو اور دوسرا ہمیں بلانے دوڑتا ہے، بلکہ ایک آدھ دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ "وہ جاتی تھی کہ ہم نکلے"۔ جن حضرات کو اس بیان میں شرارتِ ہمسایہ کی کارفرمائی نظر آئے، وہ ٹھیکیدار صاحب کے البم ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ہمارے ہاتھ کی ایک نہیں، درجنوں تصویریں ملیں گی، جن میں موصوف کیمرے کی آنکھ میں آنکھیں ڈال کر نومولود کے کان میں اذان دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

آئے دِن کی زچگیاں جھیلتے جھیلتے ہم ہلکان ہو چکے تھے، مگر بوجہ شرم و خوش اخلاقی خاموش تھے۔ عقل کام نہیں کرتی تھی کہ اس کاروبارِ شوق کو کس طرح بند کیا جائے۔ مجبورًا (انگریزی محاورے کے مطابق) مرزا کو اپنے اعتماد میں لینا پڑا۔ احوالِ پُر ملال سن کر بولے، صاحب! ان سب پریشانیوں کا حل ایک پھولدار فراک ہے۔ ہم نے کہا، مرزا! ہم پہلے ہی ستائے ہوئے ہیں۔ ہم سے یہ ابسٹریکٹ گفتگو تو نہ کرو۔ بولے، تمہاری ڈھلتی جوانی کی قسم! مذاق نہیں کرتا۔ تمہاری طرح ہمسایوں کے لختِ ہائے جگر کی تصویریں کھینچتے کھینچتے اپنا بھی بھرکس نکل گیا تھا۔ پھر میں نے تو یہ کیا کہ ایک پھولدار فراک خریدی اور اُس میں ایک نوزائیدہ بچے کی تصویر کھینچی اور اُس کی تین درجن کاپیاں بنا کر اپنے پاس رکھ لیں۔

اب جو کوئی اپنے نومولود کی تصویر کی فرمائش کرتا ہے تو یہ شرط لگا دیتا ہوں کہ اچھّی تصویر درکار ہے تو یہ خوبصورت پھولدار فراک پہنا کر کھنچواؤ۔ پھر کیمرے میں فلم ڈالے بغیر بٹن دباتا ہوں۔ اور دو تین دن کا جھلاوا دے کر اسی اُمّ التصاویر کی ایک کاپی پکڑا دیتا ہوں۔ ہر باپ کو اس میں اپنی شباہت نظر آتی ہے!

حادثات اور ابتدائی قانونی امداد

ہمارے پُرانے جاننے والوں میں آغا واحد آدمی ہیں، جن سے ابھی تک ہماری بول چال ہے۔ اس کی واحد وجہ مرزا یہ بتاتے ہیں کہ ہم نے کبھی ان کی تصویر نہیں کھینچی، گو کہ ہماری فن کارانہ صلاحیتوں سے وہ بھی اپنے طور پر مستفید ہو چکے ہیں۔ صورتِ استفادہ یہ تھی کہ ایک اتوار کو ہم اپنے "ڈارک رُوم" (جسے پیسے سینیچر تک گھر والے غسلخانہ کہتے ہیں) میں اندھیرا کیے ایک مارپیٹ سے بھرپور سیاسی جلسے کے پرنٹ بنا رہے تھے۔ گھُپ اندھیرے میں ایک مُنّا سا سُرخ بلب جل رہا تھا، جس سے بس اتنی روشنی نکل رہی تھی کہ وہ خود نظر آجاتا تھا۔ پہلے پرنٹ پر کالی جھنڈیاں صاف نظر آنے لگی تھیں، لیکن لیڈر کا چہرہ کسی طرح اُبھر کے نہیں دیتا تھا۔ لہٰذا ہم اسے بار بار چمٹی سے تیزابی محلول میں غوطے دیے جا رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے پھاٹک کی گھنٹی بجائی اور بجاتا چلا گیا۔ ہم جس وقت چمٹی ہاتھ میں لیے پہنچے ہیں، تو گھر والے ہی نہیں، پڑوسی بھی دوڑ کر آگئے تھے۔ آغا نے ہتھیلی سے گھنٹی کا بٹن دبا رکھا تھا اور لرزتی کپکپاتی آواز میں حاضرین کو بتا رہے تھے کہ وہ کس طرح اپنی سدھی سدھائی مرنجاں مرنج کار* میں اپنی راہ چلے جا رہے تھے کہ ایک ٹرام دندناتی

* اس پُرانی کار کا خاکہ ایک دُوسرے مضمون میں ملاحظہ فرمائیے۔ سرِدست اتنا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہُوئی "رانگ سائیڈ" سے آئی۔ اور اُن کی کار سے ٹکرا گئی۔ ہمارے مُنہ سے کہیں نکل گیا، "مگر تھی تو اپنی ہی پٹری پر؟" تنتناتے ہُوئے بولے "جی، نہیں! ٹیک آف کر کے آئی تھی!" یہ موقع اُن سے اُلجھنے کا نہیں تھا، اس لیے کہ وُہ جلدی مچا رہے تھے۔ بقول اُن کے، رہی سہی عزّت خاکِ کراچی میں مِلی جا رہی تھی۔ اور اسی کی خاطر ٹکّر ہونے سے ایک دو سیکنڈ پہلے ہی وُہ کار سے کُود کر غریب خانہ کی سمت روانہ ہو گئے تھے تاکہ چالان ہونے سے پہلے ہی اپنی صفائی میں بطور دلیل نمبر ۲ حادثہ کا فوری مع فوٹو گراف پیش کر سکیں۔ دلیل نمبر ۱ یہ تھی کہ جس لمحے کار ٹرام سے ٹکرائی، وُہ کار میں موجود ہی نہیں تھے۔

ہم جس حال میں تھے، اُسی طرح کیمرہ لے کر آغا کے ساتھ ہو لیے اور ہانپتے کانپتے موقع واردات پر پہنچے۔ دیکھا کہ آغا کی کار کا بمپر ٹرام کے بمپر پر چڑھا ہُوا ہے اگلا حصّہ ہَوا میں معلّق ہے اور ایک لونڈا پہیّا گھما گھما کر دُوسرے سے کہہ رہا ہے "ابے فضلُو! اس کے تو پہیّے بھی ہیں!"

آغا کا اصرار تھا کہ تصویریں ایسے زاویے سے لی جائیں، جس سے ثابت ہو کہ پہلے مُشتعل ٹرام نے کار کے ٹکّر ماری۔ اِس کے بعد کار ٹکرائی! وُہ بھی محض حفاظتِ خود اختیاری میں! ہم نے احتیاطاً ملزمہ کے ہر پوز کی تین تین تصویریں لے لیں، تاکہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۰) اشارہ کافی ہو گا کہ آغا اس میں نکلتے ہُوئے اس قدر جھینپتے ہیں کہ کبھی ہارن نہیں بجاتے۔ آخر غیروں کے طعنوں اور دوستوں کی پھبتیوں سے تنگ آکر آغا ایک دن نئی کار خریدنے نکلے۔ بیسیوں کاریں دیکھ ڈالیں۔ صرف ایک پسند آئی۔ کہنے لگے، "یہ ٹھیک رہے گی۔ اس کا بمپر بہت مضبوط ہے!" سیلز گرل نے ساٹھ ہزار چار سو قیمت بتائی۔ لیکن سودا نہ ہو سکا۔ اس لیے کہ آغا کا خیال تھا کہ اس قیمت کی کار کو تو بغیر پٹرول کے چلنا چاہیے۔

اُن میں مُبیّنہ زاویہ بھی، اگر کہیں ہو، تو آجائے۔ حادثے کو "پکچرائز" کرتے وقت ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اس پیش بندی کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اس لیے کہ جس زاویے سے مضروبہ ملزمہ پر چڑھی تھی اور جس پینترے سے آغا نے ٹرام اور قانون سے ٹکر لی تھی، اُسے دیکھتے ہُوئے ان کا چالان اقدامِ خودکشی میں بھلے ہی ہو جائے، ٹرام کو نقصان پہنچانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ادھر ہم کلِک کلِک تصویر پر تصویر لیے جا رہے تھے، اُدھر سڑک پہ تماشائیوں کا ہجوم تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم نے کیمرے میں دوسری فلم ڈالی۔ اور کار کا "کلوز اپ" لینے کی غرض سے مرزا ہمیں سہارا دے کر ٹرام کی چھت پر چڑھانے لگے۔ اتنے میں ایک گبرُو پولیس سارجنٹ بھیڑ کو چیرتا ہُوا آیا۔ آکر ہمیں نیچے اُتارا۔ اور نیچے اُتار کے چالان کر دیا ـــــــ شارعِ عام پر مجمع لگا کے عمداً رکاوٹ پیدا کرنے کے الزام میں! اور بقول مرزا، وہ تو بڑی خیریت ہُوئی کہ وہ وہاں موجود تھے۔ ورنہ ہمیں تو کوئی ضمانت دینے والا بھی نہ ملتا۔ کھِنچے کھِنچے پھرتے۔

عقدِ ثانی اور عاجز

یہ پہلا اور آخری موقع نہیں تھا کہ ہم نے اپنے حقیر آرٹ سے قانون اور انصاف کے ہاتھوں کو مضبُوط کیا۔ (معاف کیجیے ہم پھر انگریزی ترکیب استعمال کر گئے۔ مگر کیا کیا جائے، انگریزوں سے پہلے ایسا بجوگ بھی تو نہیں پڑا تھا) اپنے بیگانوں نے بارہا یہ خدمت بے مُزد ہم سے لی ہے۔ تین سال پہلے کا ذکر ہے۔ عائلی قانون (جسے مرزا قانونِ انسدادِ نکاح کہتے ہیں) کا نفاذ ابھی نہیں ہُوا تھا۔ مگر پریس میں اس کی موافقت میں تحریریں اور تقریریں دھڑا دھڑ چھپ رہی تھیں۔ جن کے گجراتی ترجموں سے گڑبڑا کر "بنولہ کنگ" سیٹھ عبدالغفور ابراہیم

حاجی محمد اسمٰعیل یونس چھابڑی والا ایک لڑکی سے چوری چھپے نکاح کر بیٹھے تھے۔ حلیہ نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔ اہلِ بینش کو اتنا اشارہ کافی ہونا چاہیے کہ اگر ہم ان کا حلیہ ٹھیک ٹھیک بتانے لگیں تو مرزا چیخ اٹھیں گے "صاحب! یہ طنز و مزاح نہیں ہے!" اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ حاشا و کلاّ۔ ہم نے کچھ عرصے سے یہ اصول بنا لیا ہے کہ کسی انسان کو حقارت سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہم نے دیکھا کہ جس کسی کو ہم نے حقیر سمجھا، وہ فوراً ترقی کر گیا۔ ہاں، تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ جس دن سے تعددِ ازدواج کا قانون لاگو ہونے والا تھا، اس کی چاند رات "کو سیٹھ صاحب غریب خانے پر تشریف لائے۔ انتہائی سراسیمگی کے عالم میں۔ ان کے ہمراہ وجہِ سراسیمگی بھی تھی۔ جو سیاہ برقع میں تھی۔ اور بہت خوب تھی۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ اور کیمرہ، اسکرین اور روشنیاں ٹھیک کرتے کرتے گیارہ بج گئے۔ گھنٹہ بھر تک سیٹھ صاحب ہماری CANDID FIGURE STUDIES کو اس طرح گھورتے رہے کہ پہلی مرتبہ ہمیں اپنے فن سے حجاب آنے لگا۔ فرمایا، "اجُن بکریلی باتوں کی پھوٹو گرا پھ لینے میں تو تم ایک نمبر استاد ہو۔ پن کوئی بھلی بیٹی کپڑے پہن کر پھوٹو کھچوائے تو کیا تمیرا کیمرا کام کریں گا؟" ہم نے کیمرے کی نیک چلنی کی ضمانت دی اور تپائی رکھی۔ تپائی پر سیٹھ صاحب کو کھڑا کیا۔ اور ان کے بائیں پہلو میں دلہن کو (سینڈل اتروا کر) کھڑا کر کے فوکس کر رہے تھے کہ وہ تپائی سے چھلانگ لگا کر ہمارے پاس آئے اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں، جس میں گجراتی سے زیادہ گھبراہٹ کی آمیزش تھی، درخواست کی کہ سرمئی پردے پر آج کی تاریخ کوئلے سے لکھ دی جائے اور فوٹو اس طرح لیا جائے کہ تاریخ صاف پڑھی جا سکے۔ ہم نے کہا، سیٹھ! اس کی کیا تک ہے؟ تپائی پر واپس

چڑھ کے اُنھوں نے بڑے زور سے ہمیں آنکھ ماری اور اپنی ٹوپی کی طرف ایسی بے کسی سے اشارہ کیا کہ ہمیں اُن کے ساتھ اپنی عزّت آبرو بھی مٹّی میں ملتی نظر آئی۔ پھر سیٹھ صاحب اپنا بایاں ہاتھ دُلہن کے کندھے پر مالکانہ انداز سے رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ دایاں ہاتھ اگر اور لمبا ہوتا تو بخدا اُسے بھی وہیں رکھ دیتے۔ فی الحال اُس میں جلتا ہُوا سگرٹ پکڑے تھے۔ ہمارا "ریڈی" کہنا تھا کہ تپائی سے پھر زقند لگا کر ہم سے لپٹ گئے۔ یا اللہ! خیر! اب کیا کفر ملا ہے سیٹھ؟ معلوم ہُوا، اب کی دفعہ وُہ بچشمِ خُود یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ کیمرے میں کیسے نظر آ رہے ہیں! خوشامد درامد کر کے پھر تپائی پر چڑھایا۔ اور قبل اس کے کہ گھڑیال رات کے بارہ بجا کر نئی صبح اور قانونِ انسدادِ نکاح کے نفاذ کا اعلان کرے، ہم نے اُن کے خُفیہ رشتۂ تمنا کحت کا مزید دستاویزی ثبوت کوڈک فلم پر محفوظ کر لیا۔

اصل دشواری یہ تھی کہ تصویر کھینچنے اور کھنچوانے کے آداب سے متعلق جو ہدایات سیٹھ صاحب بزبان گجراتی یا اشاروں سے دیتے رہے، ان کا منشا، کم از کم ہمارے فہمِ ناقص میں یہ آیا کہ دُلہن صرف اُس لمحے نقاب اُلٹے جب ہم بٹن دبائیں۔ اور جب ہم بٹن دبائیں تو عینک اُتار دیں۔ اُن کا بس چلتا تو کیمرے کا بھی "لینس" اُتروا کر تصویر کھنچواتے۔

رات کی جگار سے طبیعت تمام دِن کسلمند رہی۔ لہٰذا دفتر سے دو گھنٹے پہلے ہی اُٹھ گئے۔ گھر پہنچے تو سیٹھ صاحب ممدُوح و منکُوح کو برآمدے میں ٹہلتے ہُوئے پایا۔ گردن جھکائے، ہاتھ پیچھے کو باندھے، بیقراری کے عالم میں ٹہلے چلے جا رہے تھے۔ ہم نے کہا، سیٹھ، السّلامُ علیکم! بولے، بالیکم! پن پھلم کو گسل کب دیں گا؟ ہم نے کہا، ابھی لو، سیٹھ! پھر اُنھوں نے خواہش ظاہر کی کہ ان کی شریکِ حیات کی تصویر کو ان کی موجُودگی میں "غُسل" دیا جائے۔ ہم نے جگہ کی تنگی کا عُذر کیا، جس کے جواب میں سیٹھ صاحب نے

ہمیں بنولے کی ایک بوری دینے کا لالچ دیا۔ جتنی دیر تک فلم ڈویلپ ہوتی رہی، وہ فلش کی زنجیر سے لٹکے، اس گنہ گار کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کرتے رہے۔

ہم "فلکسر" میں آخری ڈوب دے چکے تو انھوں نے پوچھا "کلیئر آئی ہے؟" عرض کیا، بالکل صاف۔ چوبی گیرہ سے ٹپکتی ہوئی فلم پکڑ کے ہم نے انھیں بھی دیکھنے کا موقع دیا۔ شارک اسکن کا کوٹ ہی نہیں، بریسٹ پاکٹ کے بٹوے کا اُبھار بھی صاف نظر آرہا تھا۔ تاریخ نگیٹو میں اُلٹی تھی، مگر صاف پڑھی جاسکتی تھی۔ چہرے پر بھی بقول اُن کے کافی روشنائی تھی۔ اُنھوں نے جلدی جلدی دُلھن کی انگوٹھی کے نگ گنے اور انھیں پُورے پاکر ایسے مطمئن ہوئے کہ چٹکی بجا کر سگرٹ چھنگلیا میں دبا کے پینے لگے۔ بولے "مسٹر! یہ تو سولہ آنے کلیئر ہے۔ آنکھ، ناک، جیب پاکٹ، ایک ایک نگ چمکتی سنبھال لو۔ اپنے بھی کھلتے کی موا پھک! اُجن اپنی اومیگا واچ کی سُوئی بھی برو بر ٹھیک ٹیم دیتی پڑی ہے۔ گیارہ کلاک۔ اور اپن کے ہاتھ میں جو ایک ٹھو سگرٹ جلتا پڑا ہے، وہ بھی سالا ایک دم لیٹ مارتا ہے"۔ یہ کہہ کر وہ کسی گہرے سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر ایک جھٹکے سے چہرہ اُٹھا کر کہنے لگے "بڑے صاب! اس سگرٹ پہ جو سالا Player's No. 3. لکھیلا ہے، اس کی جگہ K2 بنا دو نی!"

دربارِ اکبری میں باریابی

خیر یہاں تو معاملہ سگرٹ ہی پر ٹل گیا، ورنہ ہمارا تجربہ ہے کہ سو فی صد حضرات اور ننانوے فی صد خواتین تصویر میں اپنے آپ کو پہچاننے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ باقی رہیں ایک فی صد۔ سو انھیں اپنے کپڑوں کی وجہ سے اپنا چہرہ قبول کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر اتفاق سے کپڑے بھی اپنے نہ ہوں تو پھر شوقیہ فوٹوگرافر کو چاہیے کہ وقت اور روپیہ برباد کرنے کا

کوئی اور مشغلہ تلاش کرے جس میں کم از کم مارپیٹ کا امکان تو نہ ہو۔ اس فن میں دَرک نہ رکھنے والوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے ہم صرف ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ پچھلے سال بغدادی جم خانہ میں نمبولا سے تباہ ہونے والوں کی امداد کے لیے یکم اپریل کو "اکبرِ اعظم" کھیلا جانے والا تھا۔ اور پبلسٹی کمیٹی نے ہم سے درخواست کی تھی کہ ہم ڈریس ریہرسل کی تصویریں کھینچیں تاکہ اخبارات کو دو دن پہلے مہیا کی جاسکیں۔

ہم ذرا دیر سے پہنچے۔ چوتھا سین چل رہا تھا۔ اکبرِ اعظم دربار میں جلوہ افروز تھے اور اُستاد تان سین بینجو پر حضرتِ فراغ گورکھپوری کا سہ غزلہ راگ مالکوس میں گا رہے تھے۔ جو حضرات کبھی اس راگ یا کسی سہ غزلہ کی لپیٹ میں آچکے ہیں، کچھ وہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر یہ دونوں یکجا ہو جائیں تو ان کی سنگت کیا قیامت ڈھاتی ہے۔ اکبرِ اعظم کا پارٹ جم خانے کے پروپیگنڈا سیکریٹری صبغے (شیخ صبغۃ اللہ) ادا کر رہے تھے۔ سر پر ٹین کا مصنوعی تاج چمک رہا تھا، جس میں سے اب تک اصلی گھی کی لپٹیں آرہی تھیں۔ تاجِ شاہی پر شیشے کے پیپر ویٹ کا کوہِ نور ہیرا جگمگا رہا تھا۔ ہاتھ میں اسی دھات یعنی اصلی ٹین کی تلوار۔ جیسے گھمسان کا رَن پڑتے ہی دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے وہ کدال کی طرح چلانے لگے۔ آگے چل کر ہلدی گھاٹ کی لڑائی میں یہ تلوار ٹوٹ گئی تو خالی نیام سے دادِ شجاعت دیتے رہے انجام کار یہ بھی جواب دے گیا کہ رانا پرتاپ کا سر اس سے بھی سخت نکلا۔ پھر مہابلی اس کی آخری بچی تماشائیوں کو دکھاتے ہوئے داروغہ اسلحہ خانہ کو رائج الوقت گالیاں دینے لگے حسبِ عادت غصّے میں آپے سے باہر ہو گئے۔ لیکن حسبِ عادت، محاورے کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ دوسرے سین میں شہزادہ سلیم کو آڑے ہاتھوں لیا۔ سلیم ابھی انارکلی پر اپنا وقت برباد کر رہا تھا۔ اس کا دورِ جہانگیری، بلکہ نورجہاں گیری ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ دورانِ سرزنش

ظلِ سبحانی نے دستِ خاص سے ایک طمانچہ بھی مارا جس کی آواز آخری قطاروں تک سُنی گئی۔ طمانچہ تو انارکلی کے گال پر بھی مارا تھا، مگر اس کا ذکر ہم نے مصلحتاً نہیں کیا، کیونکہ مہابلی نے کچھ اس انداز سے مارا کہ پاس سے تو کم از کم ہمیں یہی لگا کہ وہ دو منٹ تک انارکلی کا میک اپ سے تمتماتا ہوا رُخسار سہلاتے رہے۔

پانچوں اُنگلیوں پر گال کے نشان بن گئے تھے!

اکبر : شیخو! انارکلی کا سر تیرے قدموں پر ہے، مگر اس کی نظر تاج پر ہے۔

سلیم : محبت اندھی ہوتی ہے، عالم پناہ!

اکبر : مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورت بھی اندھی ہوتی ہے!

سلیم : لیکن انارکلی عورت نہیں، لڑکی ہے، عالم پناہ!

اکبر : (آستین اور تیوری چڑھا کر) اے خاندانِ تیموریہ کی آخری نشانی! اے ناخلف، مگر (کلیجہ پکڑ کے) اکلوتے فرزند! یاد رکھ، میں تیرا باپ بھی ہوں اور والد بھی!

اس ڈرامائی انکشاف کو نئی نسل کی آگاہی کے لیے ریکارڈ کرنا ازبس ضروری تھا۔ لہٰذا ہم کیمرے میں "فلیش گن" رفٹ کر کے آگے بڑھے۔ یہ احساس ہمیں بہت بعد میں ہوا کہ جتنی دیر ہم فوکس کرتے رہے، مہابلی اپنا شاہی فریضہ یعنی ڈانٹ ڈپٹ چھوڑ چھاڑ سانس روکے کھڑے رہے۔ وہ جو یکلخت خاموش ہوئے تو پچھلی نشستوں سے طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں:

"ابے! ڈائیلاگ بھول گیا کیا؟"

"طمانچہ مار کے بیہوش ہو گیا ہے!"

"مہابلی! منہ سے بولو۔"

اگلے سین میں فلمی تکنیک کے مطابق ایک "فلیش بیک" تھا۔ مہابلی کی جوانی تھی اور اُن کی مونچھوں پر ابھی پاؤڈر نہیں بُرکا گیا تھا۔ باغیِ اعظم، ہیمو بقال (تماشائیوں کی طرف منہ کرکے) سجدے میں پڑا تھا۔ اور حضرتِ ظلِ سبحانی تلوار سونتے بُھٹا سا اُس کا سر اُڑانے جا رہے تھے۔ ہم بھی تڑ سے کھینچنے لپکے۔ لیکن فٹ لائٹس سے کوئی پانچ گز دور ہوں گے کہ پیچھے سے آواز آئی ——— بیٹھ جاؤ، یوسف کارش! اور اس کے فوراً بعد ایک نامہرباں ہاتھ نے بڑی بے دردی سے پیچھے سے کوٹ پکڑ کے کھینچا۔ پلٹ کے دیکھا تو مرزا نکلے۔ بولے "ارے صاحب! ٹھیک سے قتل تو کر لینے دو۔ ورنہ سالا اُٹھ کے بھاگ جائے گا اور پھر علمِ بغاوت بلند کرے گا!"

دوسرے ایکٹ میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ یعنی قتل نہیں ہوا۔ پانچوں مناظر میں شہزادہ سلیم انارکلی کو اس طرح حالِ دل سناتا رہا، گویا املا لکھوا رہا ہے۔ تیسرے ایکٹ میں جیسے ہمارا مطلب ہے ظلِ سبحانی شاہی پہلوان کی گرزوں اہی ربر کی نے (جس سے دن میں حمام خانے کے ان کو پانی دیا گیا تھا) ہاتھ میں تھامے انارکلی پر برس رہے تھے اور ہم حاضرین کی ہوٹنگ کے ڈر سے "ونگ" میں دبکے ہوئے اس سین کو فلما رہے تھے کہ سامنے کے ونگ سے ایک شیر خوار اسٹیج پر گھٹنیوں چلتا ہوا آیا اور گلا پھاڑ پھاڑ کے رونے لگا۔ بالآخر مامتا، عشق اور اداکاری پر غالب آئی اور اس عفیفہ نے تختِ شاہی کی اوٹ میں حاضرین سے پیٹھ کرکے اس کا منہ قدرتی غذا سے بند کیا۔ ادھر مہابلی خون کے سے گھونٹ پیتے رہے کہ سے آگے بڑھ کر پردہ گرایا۔

آخری ایکٹ کے آخری سین میں اکبرِ اعظم کا جنازہ بینڈ باجے کے ساتھ بڑے

دھوم دھڑکے سے نکلا۔ جسے فلمانے کے بعد ہم گرین رُوم میں گئے اور صبغے کو مبارکباد دی کہ اس سے بہتر مُردے کا پارٹ آج تک ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اُنھوں نے بطورِ شکریہ کورے کفن سے ہاتھ نکال کر ہم سے مصافحہ کیا۔ ہم نے کہا، صبغے! اور تو جو کچھ ہُوا سو ہُوا، مگر اکبر کو کوہِ نور ہیرا کب لگاتا تھا؟ کہنے لگے، جبھی تو ہم نے نقلی کوہِ نور لگایا تھا!

''ڈیولپر'' کو برف سے ۷۰ ڈگری ٹھنڈا کر کے ہم نے راتوں رات فلم ڈویلپ کی اور دُوسرے دن حسب وعدہ تصویروں کے پروف دِکھانے جم خانہ پہنچے۔ گھڑی ہم نے آج تک نہیں رکھی۔ اندازاً رات کے گیارہ بج رہے ہوں گے۔ اس لیے کہ ابھی تو ڈِنر کی میزیں سجائی جا رہی تھیں، اور ان کو زینت بخشنے والے ممبران ''رین بو رُوم'' (بار) میں اُونچے اُونچے اسٹولوں پر ٹنگے نہ جانے کب سے ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی ممبران ہمارے جامِ صحت کی آخری بُوند نوش کر چکے، ہم نے اپنے چرمی بیگ سے ''رش پرنٹ'' نکال کر دِکھلائے ـــــ اور صاحب! وُہ تو خُدا نے بڑا فضل کیا کہ ان میں سے ایک بھی کھڑے ہونے کے قابل نہ تھا۔ ورنہ ہر ممبر، کیا مرد، کیا عورت، آج ہمارے قتل میں ماخوذ ہوتا۔

ظلِّ سُبحانی نے فرمایا، ہم نے انارکلی کو اس کی بے راہ روی پر ڈانٹتے وقت آنکھ نہیں ماری تھی۔ شہزادہ سلیم اپنا فوٹو ملاحظہ فرما کر کہنے لگے کہ یہ تو نگیٹو ہے! شیخ ابوالفضل نے کہا، نُور جہاں بیوۂ شیر افگن تصویر میں سراپا مرد افگن نظر آتی ہے۔ راجہ مان سنگھ کڑک کر بولے کہ ہمارے آبِ رواں کے انگرکھے میں ٹوڈرمل کی پسلیاں کیسے نظر آ رہی ہیں؟ مُلّا دوپیازہ نے پوچھا، یہ میرے ہاتھ میں دس اُنگلیاں کیوں لگا دیں آپ نے؟ ہم نے کہا، آپ ہِل جو گئے تھے۔ بولے، بالکل غلط۔ خُود آپ کا ہاتھ ہِل رہا تھا۔ بلکہ میں نے ہاتھ سے

آپ کو اشارہ بھی کیا تھا کہ کیمرہ مضبوطی سے پکڑیے۔ انار کلی کی والدہ★ کہ بڑے کلّے ٹھلّے کی عورت ہیں، ننک کر بولیں، اللہ نہ کرے، میری چاندسی بنّو ایسی ہو (اُن کی بنّو کے چہرے کو اگر واقعی چاند سے تشبیہ دی جاسکتی تھی، تو یہ وُہ چاند تھا، جس میں بُڑھیا بیٹھی چرخا کاتتی نظر آتی ہے۔) مختصر یہ کہ ہر شخص شاکی، ہر شخص خفا۔ اکبرِ اعظم کے نو رتن تو نو رتن، خواجہ سرا تک ہمارے خوُن کے پیاسے ہو رہے تھے۔

پَیدا ہونا پیسہ کمانے کی صُورت کا

ہم سے جِم خانہ چھُوٹ گیا۔ اَوروں سے کیا گِلہ، صبغے تک کھِنچے کھِنچے رہنے لگے۔ ہم نے بھی سوچا، چلو، تُم رُوٹھے، ہم چھُوٹے۔ واحسرتا کہ اُن کی خفگی اور ہماری فراغت چند روزہ ثابت ہُوئی۔ کیونکہ دس پندرہ دِن بعد اُنھوں نے اپنے فلیٹ واقع چھٹی منزل پر "صبغے ایڈورٹائزرز (پاکستان) پرائیویٹ لیمیٹڈ" کا شوخ سا سائن بورڈ لگا دیا، جسے اگر بیچ سڑک پر لیٹ کر دیکھا جاتا تو صاف نظر آتا۔ دُوسرا نیک کام اُنھوں نے یہ کیا کہ ہمیں ایک نئے صابن "اسکنڈال سوپ" کے اشتہار کے لیے تصویر کھینچنے پر کمیشن (مامُور) کیا۔ عجب اِتّفاق ہے کہ ہم خود کُچھ عرصے سے بڑی شِدّت سے محسُوس کر رہے تھے کہ ہمارے ہاں عورت، عبادت اور شراب کو اب تک کلوروفارم کی جگہ اِستعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی درد و اذیّت کا

★ انار کلی کی والدہ : یہ خُود بھی ایک زمانے میں یہُودی کی لڑکی کا کردار ادا کر چکی ہیں۔ یادِ ایّام! اِسی رول میں مرزا کی طبیعت ان پر آئی تھی۔ اب بھی بے شمار "مابعد الطّبیعت" تصویریں موصُوف کے البم میں اُن دنوں کی یاد تازہ کرتی ہیں، جب مرزا فلسفہ میں ایم۔اے کرنے کے بعد فلسفہ کی حدّت کو حماقتوں سے معتدل کر رہے تھے۔

احساس مٹانے کے لیے، نہ کہ سرور و انبساط کی خاطر۔ اسی احساس کو سُن کر دینے والی پینک کی تلاش میں تھکے ہارے فنونِ لطیفہ تک پہنچتے ہیں۔ اور یہ ظاہر سی بات ہے کہ ایسی عیاشی کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا جا سکتا۔ چنانچہ پہلی ہی بولی پر ہم نے اپنی متاعِ ہنر سے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر معاوضہ بھی معقول تھا۔ یعنی ڈھائی ہزار روپے۔ جس میں سے تین روپے نقد انھوں نے ہمیں اسی وقت ادا کر دیے۔ اور اسی رقم سے ہم نے گیورٹ کی ۲۷ ڈگری کی سست رفتار فلم خریدی، جو جِلد کے نکھار اور نرمی کو اپنے اندر دھیرے دھیرے سمو لیتی ہے۔ "چہرہ" مہیا کرنے کی ذمہ داری اسکنڈل سوپ بنانے والوں کے سر تھی۔ تصویر کی پہلی اور آخری شرط یہ تھی کہ "سیکسی" ہو۔ اس مقصدِ جمیل کے لیے جس خاتون کی خدمات پیش کی گئیں، وہ برقع میں نہایت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ برقع اترنے کے بعد کھلا کہ

خوب تھا پردہ، نہایت مصلحت کی بات تھی

سیکس اپیل تو ایک طرف رہی، اس دُکھیا کے تو منہ میں مکھن بھی نہیں پگھل سکتا تھا۔ البتہ دوسری ماڈل کا باکفایت لباس اپنے مضمرات کو چھپانے سے بوجوہ قاصر تھا۔ ہم نے چند رنگین "شاٹ" تیکھے تیکھے زاویوں سے لیے اور تین چار دن بعد مرزا کو پروجیکٹر سے TRANSPARENCIES دکھائیں۔ کوڈک کے رنگ دہک رہے تھے۔ سرکش خطوط پکار پکار کر اعلانِ جنس کر رہے تھے ہم نے اس پہلو پر توجہ دلائی تو ارشاد ہوا، یہ اعلانِ جنس ہے یا کپڑے کی صنعت کے خلاف اعلانِ جنگ؟

تیسری "سٹنگ" (نشست) سے دس منٹ پیشتر مرزا حسبِ وعدہ ہماری کمک پر آ گئے سوچا تھا، کچھ نہیں تو دُسراتھ رہے گی۔ پھر مرزا کا تجربہ، بسبب اُن طبع زاد غلطیوں کے، جو وہ کرتے رہتے ہیں، ہم سے کہیں زیادہ وسیع و گوناگوں ہے۔ لیکن انھوں نے تو آتے ہی آفت مچا

دی۔ اصل میں وُہ اپنے نئے "رول" (ہمارے فنّی مُشیر) میں پھُولے نہیں سما رہے تھے۔ اب سمجھ میں آیا کہ نیا نوکر دوڑ کر ہرن کے سینگ کیوں اُکھاڑتا ہے اور اگر ہرن بھی نیا ہو تو

اسدُ اللہ خاں قیامت ہے!

ویسے بھی میک اپ وغیرہ کے بارے میں وُہ کچھ تعصّبات رکھتے ہیں، جنھیں اس وقت ماڈل کے چہرے پر تھوپنا چاہتے تھے (مثلاً کالی عورتوں کے بارے میں اُن کا خیال ہے کہ انھیں سفید سُرمہ لگانا چاہیے۔ اَدھیڑ مرد کے دانت بہت اُجلے نہیں ہونے چاہئیں ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ مصنوعی ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس)۔ بولے، لپ اسٹک پر ویسلین لگواؤ۔ اس سے ہونٹ VOLUPTUOUS معلوم ہونے لگیں گے۔ آج کل کے مرد اُبھرے اُبھرے گُردا سے ہونٹ پہ مرتے ہیں۔ اور ہاں یہ بھٹیچر عینک اُتار کے تصویر لو۔ ہم نے رفع شر کے لیے فوراً عینک اُتار دی۔ بولے، صاحب! اپنی نہیں اُس کی۔ بعد ازاں ارشاد ہُوا، فوٹو کے لیے نئی اور جمکیلی ساری قطعی موزُوں نہیں۔ خیر۔ مگر کم از کم سینڈل تو اُتروا دو۔ پُرانا پُرانا لگتا ہے ہم نے کہا، تصویر چہرے کی لی جارہی ہے، نہ کہ پیروں کی۔ بولے، اپنی ٹانگ نہ اَڑاؤ۔ جیسے اُستاد کہتا ہے وُیسی کرو۔ ہم نے بیگم کا شمپین کے رنگ کا نیا سینڈل لاکر دیا۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ اسے پہن کر اُس کے "ایکسپریشن" میں ایک خاص تمکنت آگئی۔ بولے، صاحب! یہ تو ہوتا ہے۔ اگر کسی کے بنیان میں چھید ہو تو اس کا اثر بھی چہرے کے ایکسپریشن پر پڑتا ہے یہ نکتہ بیان کرکے وُہ ہمارے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔

آنکھیں میری باقی اُن کا

ایڑی سے چوٹی تک اصلاحِ حُسن کرنے کے بعد اُسے سامنے کھڑا کیا اور وُہ پیاری

پیاری نظروں سے کیمرے کو دیکھنے لگی تو مرزا پھر بین بجانے لگے "صاحب! یہ فرنٹ پوز، یہ دو کانوں بیچ ایک ناک والا پوز صرف پاسپورٹ میں چلتا ہے۔ آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ اس کی گردن لمبی ہے اور ناک کا کٹ یونانی۔ چہرہ صاف کہے دیتا ہے کہ میں صرف پروفائل کے لیے بنایا گیا ہوں"۔ ہم نے کہا "اچھا، بابا! پروفائل ہی سہی"۔

اس تکنیکی سمجھوتے کے بعد ہم نے ترت پھرت کیمرے میں "کلوزاپ لینس" فٹ کیا۔ سُرمئی پردے کو دو قدم پیچھے کھسکایا۔ سامنے ایک سبز کانٹے دار "کیکٹس" رکھا اور اس پر پانچ سو واٹ کی اسپاٹ لائٹ ڈالی۔ اس کی اوٹ میں گلِ رُخسار۔ ہلکا سا آوٹ آف فوکس تاکہ خطوط اور ملائم ہو جائیں۔ وہ دسویں دفعہ تن کر کھڑی ہوئی۔ سینہ بفلک کشیدہ، نچلا ہونٹ صوفیہ لارین کی طرح آگے کو نکالے۔ آنکھوں میں "ادھر دیکھو، مری آنکھوں میں کیا ہے" والی کیفیت لیے۔ اور میٹھی میٹھی روشنی میں بل کھاتے ہوئے خطوط نغمہ گیت گانے لگے۔ رنگ پھر گونجنے لگے۔ آخری بار ہم نے دیدبان سے اور مرزا نے کیمرے سے پیار بھری نظر سے دیکھا۔ مسکراتی ہوئی تصویر لینے کی غرض سے ہم نے ماڈل کو آخری ... رندانہ ہدایت دی کہ جب ہم بٹن دبانے لگیں تو تم ہرے ہرے کہتی رہنا:

چیز، چیز، چیز، چیز۔

یہ سُننا تھا کہ مرزا نے ہمارا ہاتھ پکڑ لیا اور اسی طرح برآمدے میں لے گئے۔ بولے، کتنے فاقوں میں سیکھی ہے یہ ٹرک؟ کیا ریڑھ ماری ہے مسکراہٹ کی! صاحب! ہر چہرہ ہنسنے کے لیے نہیں بنایا گیا۔ خصوصاً مشرقی چہرہ۔ کم از کم یہ چہرہ! ہم نے کہا، جناب! عورت کے چہرے پر مشرق مغرب بتانے والا قطب نما تھوڑا ہی لگا ہوتا ہے۔ یہ تو لڑکی ہے بدھ تک کے ہونٹ مسکراہٹ سے خم ہیں۔ لنکا میں ناریل اور پام کے درختوں سے گھری

ہوئی ایک نیلی جھیل ہے، جس کے بارے میں یہ روایت چلی آتی ہے کہ اس کے پانی میں ایک دفعہ گوتم بدھ اپنا چہرہ دیکھ کر یونہی مسکرا دیا تھا۔ اب ٹھیک اسی جگہ ایک خوبصورت مندر ہے جو اس مسکراہٹ کی یاد میں بنایا گیا ہے۔ مرزا نے وہیں بات پکڑ لی۔ بولے، صاحب! گوتم بدھ کی مسکراہٹ اور ہے، مونا لیزا کی اور! بدھ اپنے آپ پر مسکرایا تھا۔ مونا لیزا دوسروں پر مسکراتی ہے۔ شاید اپنے شوہر کی سادہ لوحی پر! بدھ کی مورتیاں دیکھو۔ مسکراتے وقت اس کی آنکھیں جھکی ہوئی ہیں۔ مونا لیزا کی کھلی ہوئی۔ مونا لیزا ہونٹوں سے مسکراتی ہے۔ اس کا چہرہ نہیں ہنستا۔ اس کی آنکھیں نہیں ہنس سکتیں۔ اس کے برعکس اجنتا کی عورت کو دیکھو۔ اس کے لب بند ہیں۔ مگر خطوط کھل کھیلتے ہیں۔ وہ اپنے سموچے بدن سے مسکرانا جانتی ہے۔ ہونٹوں کی کلی ذرا نہیں کھلتی، پھر بھی اس کا ہرا بھرا بدن، اس کا انگ انگ مسکرا اٹھتا ہے۔ ہم نے کہا، مرزا! اس میں اجنتا ایلورا کا اجارہ نہیں۔ بدن تو مارلن منرو کا بھی کھلکھلاتا تھا! بولے، کون مسخرہ کہتا ہے؟ وہ غریب عمر بھر ہنسی اور ہنسانہ آیا۔ صاحب! ہنسنا نہ آیا، اس لیے کہ وہ جنم جنم کی رنڈاسی تھی۔ اس کا رواں رواں بلاوے دیتا رہا۔ اس کا سارا وجود، ایک ایک پور، ایک ایک مسام

انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

وہ اپنے چھتنار بدن، اپنے سارے بدن سے آنکھ مارتی تھی۔ مگر ہنسی؟ اس کی ہنسی ایک لذت بھری سسکی سے کبھی آگے نہ بڑھ سکی۔ اچھا۔ آؤ۔ اب میں تمھیں بتاؤں کہ ہنسنے والیاں کیسے ہنسا کرتی ہیں:۔

جات ہتی اک نار اکیلی، سو بیچ بجار بھیو مجرائے
آپ ہنسی کچھ نین ہنسے، کچھ نینن بیچ ہنسو کجرائے

ہار کے بیچ ہمیل ہنسی، باجو بندن بیچ ہنسو گجرائے
بھویں مرور کے ایسی ہنسی جیسے چندر کو داب چلو بدرائے

مرزا برج بھاشا کی اس چوپائی کا انگریزی ترجمہ کرنے لگے اور ہم کان لٹکائے سنتے رہے۔ لیکن ابھی وہ تیسرے مصرعہ کا خون نہیں کر پائے تھے کہ بسنے کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ کیونکہ ماڈل 'سو' روپے فی گھنٹہ کے حساب سے آئی تھی اور ڈیڑھ سو روپے گزر جانے کے باوجود ابھی پہلی کلک کی نوبت نہیں آئی تھی۔

تصویریں کیسی آئیں؟ تین کم ڈھائی ہزار روپے وصول ہوتے یا نہیں؟ اشتہار کہاں چھپا؟ لڑکی کا فون نمبر کیا ہے؟ اسکنڈل سوپ فیکٹری کب نیلام ہوئی؟ ان تمام سوالات کا جواب ہم، انشاء اللہ، بہت جلد بذریعہ مضمون دیں گے۔ سردست قارئین کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ مرزا کے جس پالے پوسے کیکٹس کو ہم نے رخِ روشن کے آگے رکھا تھا، اُسے فروری میں پھولوں کی نمائش میں پہلا انعام ملا۔

(جولائی - ۱۹۶۴ء)

اُردو ادب کی ایک عہد آفریں کتاب

مشتاق احمد یوسفی

کے مضامین کا پہلا مجموعہ

چراغ تلے